جلد ۷۷ اگست ۱۹۷۲ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

اِدارہ "ترجمان القرآن" انتہائی مُسرّت سے اعلان کرتا ہے کہ

تفہیمُ القرآن جلد ششم

(سُورۃ تحریم ——— سُورہ النّاس)

کی طباعت کا کام بفضلہٖ تعالیٰ شروع ہو گیا ہے انشاءاللہ العزیز جلد پنجم کی طرح جلد ششم بھی، بہترین کاغذ، دیدہ زیب طباعت اور خوبصورت اور مُزیّن جلد کے ساتھ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ رہی ہے۔

کاروباری حضرات آج ہی اپنی فرمائش سے آگاہ فرمائیں۔

ادارہ اپنے قارئینِ کرام کے تعاوُن کا شکر گزار ہے۔

اِدارۂ ترجمان القُرآن، اِچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

عدد ۶	اگست ۱۹۷۲ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۹۲ھ	جلد ۷۷

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک-اچھرہ-لاہور

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مرض خواہ بظاہر کتنا ہی معمولی ہو مگر نتائج کے اعتبار سے اس وقت انتہائی پریشان کن صورت اختیار کر لیتا ہے جب مریض کے اندر اپنی علالت کا احساس ختم ہو جائے اور وہ مرض کو صحت کو سمجھتے ہوئے اس پر ذہنی اعتبار سے اطمینان کا اظہار کرنے لگے۔ یہ بات جس قدر جسمانی امراض کے بارے میں صحیح ہے اسی قدر افراد اور قوموں کے روحانی اور اخلاقی عوارض کے بارے میں بھی درست ہے۔ کسی اخلاقی انحطاط کے شکار فرد اور روبہ زوال قوم کی زندگی اس وقت تشویشناک مرحلے میں داخل ہوتی ہے جب فرد اور قوم کے دل میں احساسِ زیاں کی چنگاری بجھ جاتے اور انحطاط اور زوال پر کرب و اضطراب کی ٹیس محسوس کرنے کے بجائے قلب و دماغ آسودگی تلاش کرنے لگیں۔ یہ کیفیت اس امر کی واضح شہادت فراہم کرتی ہے کہ اس فرد اور قوم میں اصلاحِ حال کی کوئی اُمنگ اور ولولہ باقی نہیں رہا اور وہ اپنی بربادی کو اپنا مقدر سمجھ کر اُس کے ساتھ ذہنی مناسبت پیدا کرنے کے لیے تیار ہے۔ یہ بات اگرچہ بڑی تکلیف دہ ہے مگر ہے بالکل صحیح کہ ہم اہلِ پاکستان بحیثیتِ قوم مرض کے اسی تشویشناک مرحلے میں سے گذر رہے ہیں جس میں ہم انحطاط اور بربادی کے ساتھ ذہنی مناسبت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے مختلف حیلے بہانے تراشتے رہتے ہیں۔ ہماری اس المناک اخلاقی حالت کی یُوں تو متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر ہم یہاں صرف چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

جن لوگوں نے اُس تحریک کا مطالعہ کیا ہے جس کے نتیجے میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلامی نظام کے اِحیاء کے نعرے نے اس تحریک کو قوت و توانائی بخشی اور اس نیم برّاعظم کے مسلمان خواہ اُن کا تعلق ہندو اکثریت کے علاقوں سے تھا یا مسلم اکثریت کے

علاقوں سے دیوانہ وار اس کی طرف بڑھے اور جان و مال کی بے مثال قربانیاں دیکر پاکستان کی شکل میں ایک خطۂ ارض اس توقع پر حاصل کیا کہ یہ اسلام کا گہوارا ہو گا۔ احیائے اسلام کے مقدس جذبے کو سینے میں لیے ہوئے عوام نے جس نہج پر جدوجہد کی اُس سے انہوں نے ایک سبق یہ بھی سیکھا کہ دورِ حاضر میں مسلمانوں کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے آمرانہ ہتھکنڈے استعمال کرنے سے پوری طرح اجتناب کرنا چاہیے اور جمہوری ذرائع سے اسلامی نظام کے قیام کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر جمہوری راستوں سے بعض اوقات برسوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے اور آناً فاناً حالات کا رُخ بدلنے کی کئی ایک صورتیں نکل آتی ہیں مگر پوری انسانی تاریخ میں اسی نوعیت کے جو لاتعداد تجربات کیے گئے ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ان راستوں سے جو انقلابات بھی آئے ہیں ان میں سے بہت کم نتائج کے اعتبار سے انسانیت کے لیے کسی دیرپا خیر اور بھلائی کے ضامن بنے ہیں جو انقلابات سازشوں کے ذریعہ آتے ہیں وہ سازشوں اور زیرِ زمین سرگرمیوں کو اپنی آغوش میں پالتے ہیں اور اس طرح معاشرے کو آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر ڈال دیتے ہیں جہاں انسانوں کی اجتماعی زندگی ہر وقت زیر و زبر ہوتی رہتی ہے یا اُسے زیر و زبر ہونے کا برابر کھٹکا لگا رہتا ہے۔ جمہوریت کا راستہ اگرچہ لمبا راستہ ہوتا ہے اور اس پر گامزن ہو کر کوئی انقلاب برپا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ لیکن اس راستے سے جو انقلاب آتا ہے وہ نتائج کے اعتبار سے نہ صرف مفید بلکہ دیرپا بھی ہوتا ہے۔ اس میں سازشوں کو پرورش پانے کے بہت کم مواقع میسر آتے ہیں اور اگر بگاڑ پیدا بھی ہو تو اُس کا بروقت مؤثر تدارک کیا جا سکتا ہے۔

احیائے اسلام کا ارفع و اعلیٰ نصب العین اور جمہوریت کا محفوظ و مامون راستہ ان دو چیزوں کو قلب و دماغ میں رکھ کر تحریک پاکستان نے اپنے سفر کا آغاز کیا مگر اس ملک کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی ان دونوں کے خلاف خوفناک سازشوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تاکہ اہلِ پاکستان اپنی صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگا کر گوہرِ مقصود پانے کے بجائے تخریب و بربادی کا شکار ہوں۔ اسلام کے بارے میں لوگوں کے اندر فکر و نظر اور جذبہ و احساس کی جو ہم آہنگی موجود تھی اُسے ختم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جانے لگا اور اس کام میں جن لوگوں نے بھی کوئی خدمت سرانجام

دینے کی پیش کش کی اُن کی حکومت کی طرف سے پوری طرح حوصلہ افزائی کی گئی ۔ خلافِ اسلام تحریکات اور نظریات کی باقاعدہ سرپرستی کی گئی اور ابلاغِ عامہ کے جس قدر ذرائع ملک میں موجود تھے فکری انتشار پھیلانے والوں کو ان سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کیے گئے۔ ملک میں نظامِ تعلیم وہ رائج کیا گیا جو نوخیز نسلوں کو خدا کا مطیع و فرمانبردار بنانے کے بجائے اوّل تو اس کا باغی بنائے لیکن اگر یہ "مطلوبہ معیار" حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم اُن کے ذہنوں کو تشکک کی آماجگاہ بنا کر انہیں عملاً ماؤف کر دے تا کہ وہ اسلام کے لیے بالکل بیکار ہو کر رہ جائیں۔ اسلام کے خلاف ان سب تخریبی کارروائیوں کے نتائج سامنے ہیں۔ اتحاد کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں اور انتشار کے تاریک سائے زندگی کے ہر شعبے میں بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتے جا رہے ہیں۔ اسلامی اخوت کا جذبہ تیزی کے ساتھ مٹتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ چھوٹی چھوٹی قومیتیں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات لیے ہوئے معرضِ وجود میں آ رہی ہیں۔ ایک خدا اور ایک رسول کو ماننے والی وہ قوم جو آج سے ۲۷ برس پیشتر یہ دعویٰ لے کر اٹھی تھی کہ اس کی قومیت کی اساس رنگ، نسل، زبان کسی بھی مادی چیز پر نہیں بلکہ محض ایک عقیدے پر ہے، اُس کے افراد آج رنگ، نسل اور زبان کے جھگڑوں میں اُلجھ کر ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہیں۔

یہ سب کچھ یونہی محض اتفاقی طور پر تو نہیں ہو رہا بلکہ اس کے پیچھے کُفر کی ایک منظم سازش موجود ہے جو اس ملک کو قوت و طاقت کے سب سے بڑے سرمدی سرچشمے سے محروم کرنا چاہتی ہے تا کہ اس کا وجود باقی نہ رہے۔

اِس خطۂ پاک میں اسلام کا جو حشر ہوا ہے وہ اب کوئی ڈھکی چھپی داستان نہیں رہی۔ اس کے اثرات اتنے نمایاں ہو چکے ہیں کہ کوئی ان سے آنکھیں بند بھی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ اسلام کے ساتھ ساتھ یہاں جمہوریت کی بھی جس طرح مٹی پلید ہوئی ہے یہ سانحہ بھی کسی اعتبار سے کم المناک نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ پاکستان نے احیاءِ اسلام کے لیے جمہوری راستہ اختیار کرنے میں جس تدبّر کا ثبوت دیا تھا اور جس سے یہ اُمید کی جا سکتی تھی کہ دوسرے مسلمان ممالک جن سازشوں کا شکار ہو کر برباد ہو رہے ہیں اُس بربادی سے پاکستان بچ جائے گا، وہ طاغوتی طاقتوں کے لیے

خطرے کا بہت بڑا الارم تھا۔ اس لیے وہ اسلام کی بیخ کنی کرنے کے ساتھ ساتھ اول روز سے اس بات کے لیے بھی برابر کوشاں رہیں کہ اس ملک کو جمہوریت کے راستے سے ہٹا کر آمریت کی راہ پر ڈالنے کا اہتمام کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے باقاعدہ سازشیں تیار کی گئیں اور ان سرکاری ملازموں کی پشت پناہی کی گئی جن کی وساطت سے اس ملک کو آمریت کے تسلط میں دیا جا سکتا تھا۔

جو لوگ تھوڑی بہت سیاسی بصیرت رکھتے ہیں۔ انہیں تو بالکل ابتدا ہی میں اس بات کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ ملک کو آمریت کے چنگل میں گرفتار کرنے کے لیے مذموم کوششیں کی جا رہی ہیں۔ چنانچہ جب سرحد میں آئی۔ جی پولیس کو وزیر اعلیٰ کا منصب سونپا گیا، اور پنجاب کے آئی۔ جی کو بلوچستان میں بطور پولیٹیکل ایجنٹ تعینات کیا گیا، تو اس وقت ہی اس ملک کے خیر خواہوں کا ماتھا ٹھنکا۔ انہوں نے آنے والے خطرات کی طرف واضح الفاظ میں اشارہ کیا۔ مگر ارباب حکومت نے ان کی باتوں کو قطعاً درخور اعتنا نہ سمجھا اور ملک آہستہ آہستہ آمریت کی طرف بڑھتا رہا۔ ابھی تھوڑی مدت گزرنے بھی نہ پائی تھی کہ لاہور میں مارشل لا کا نفاذ کر کے عوام کے رد عمل کو معلوم کرنے کی کوشش کی گئی اور ارباب حکومت نے جب حالات کو آمریت کے لیے سازگار پایا تو ایک سرپھرے گورنر جنرل نے جس کی عمر کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں گزرا تھا، اسمبلی کو توڑ کر آمریت کی باقاعدہ ابتدا کر دی۔ اس کی اس مجنونانہ حرکت کو عدالت میں چیلنج کیا گیا۔ یہ ایک ایسا نازک اور فیصلہ کن مرحلہ تھا کہ اگر اس وقت عدالت جرأت اور تدبر سے کام لے کر صحیح فیصلہ صادر کر دیتی تو نہ صرف جمہوریت کی پٹڑی سے اتری ہوئی گاڑی دوبارہ پٹڑی پر آ جاتی بلکہ جو لوگ اس قسم کے ناپاک عزائم سینوں میں پال رہے تھے ان کے حوصلے بھی پست ہو جاتے مگر افسوس کہ ایک عاقبت نا اندیش جج کے ذاتی رجحانات اور مصالح کی وجہ سے گورنر جنرل کی اس غیر قانونی بلکہ تباہ کن حرکت کو سند جواز حاصل ہو گئی اور اس طرح وہ سارے مہم جو جو اس ملک میں آمر بننے کے خواب دیکھ رہے تھے، انہوں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ ملک غلام محمد کے بعد ایک ڈیفنس سکرٹری ملک کا سربراہ بن بیٹھا اور بالآخر اس کی سرپرستی میں ملک کے اندر فوجی انقلاب لایا گیا اور فوج کا وہ کمانڈر جسے قوم نے دفاع وطن کا فریضہ سونپ رکھا تھا، اس نے سارے دستوری ضابطوں اور روایات کو توڑتے ہوئے اور اس بلند منصب کے وقار اور عہد و پیمان کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے

مسندِ حکومت پر بالجبر قبضہ کر لیا۔ بے بصیرت لوگوں نے اس کو نجات دہندہ سمجھتے ہوئے اس کا والہانہ استقبال کیا لیکن جو لوگ سیاسی مسائل کی تھوڑی سی بھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے ان سے یہ حقیقت کسی طرح بھی پوشیدہ نہ تھی کہ آمریت کی راہ پر چل کر کبھی بھی کسی قوم نے فلاح و کامرانی کی راہ نہیں پائی بلکہ اس راہ پر گامزن ہو کر قومیں ہمیشہ تباہ و برباد ہی ہوئی ہیں۔ تاریخ کے اس اہم فیصلے کو سمجھنے کے لیے کسی غیر معمولی قابلیت یا فہم و تدبر کی ضرورت نہیں۔ تاریخ کا یہ فیصلہ اس سادہ سی حقیقت پر مبنی ہے کہ کوئی غیر نبی، خواہ فکر و عمل کی کتنی ہی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہو، اجتماعی زندگی کے سارے معاملات تنہا حل نہیں کر سکتا۔ وہ جب بھی اپنے ذمے یہ وسیع کام لیتا ہے تو لازمی طور پر ناکام ہوتا ہے مگر اُس کا آمرانہ مزاج اُسے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرنے میں ہمیشہ مانع رہتا ہے اور وہ ہر اُس فرد یا گروہ کو گردن زدنی سمجھتا ہے جو اُس سے اختلاف کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اردگرد خوشامدیوں کا لاؤلشکر جمع ہو جاتا ہے جو اُسے غلط راستے پر جانے سے باز رکھنے کے بجائے اُسی پر برق رفتاری کے ساتھ گامزن ہونے میں مدد دیتا ہے۔ خوشامدیوں کے اس ٹولے کو نہ تو اس آمر سے کوئی حقیقی دلچسپی ہوتی ہے اور نہ اُسے ملک و ملت کی خیر خواہی مطلوب ہوتی ہے اس کے پیشِ نظر تو صرف ایک مقصد ہوتا ہے کہ صاحبِ اقتدار کا کسی نہ کسی طرح قرب حاصل کر کے ہر قسم کے جائز و ناجائز فوائد حاصل کیے جائیں۔ اس لیے کاسہ لیسوں کا یہ گروہ کبھی بھی کسی آمر کو کوئی ایسا مشورہ نہیں دیتا جس سے اُس کا مزہ کِرکِرا ہونے کا کوئی امکان ہو۔ بلکہ یہ اُس کی ہر بات اور ہر حرکت پر تعریف کے ڈونگرے برساتا ہے خواہ وہ کتنی ہی غلط اور ملک و ملت کے لیے کتنی تباہ کن ہو۔ یہ بے ضمیر ٹولہ اصحابِ اقتدار کو یہی باور کراتا رہتا ہے کہ حضور کا اقبال ترقی پر ہے۔ بس چند ہی لوگ ایسے ہیں جو آپ کی اقبال مندی سے جل کر راکھ ہو رہے ہیں۔

یہی وہ مفاد پرست اور بے ضمیر ٹولہ تھا جس نے انگریز کے دور میں غیر ملکی استعمار کا ساتھ دیا، اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بے دریغ ہو کر اپنے بھائی کا گلا کاٹا۔ اس کے بعد جب اس نے یہ محسوس کیا کہ انگریز اس ملک کو چھوڑنے پر مجبور ہے تو یہ ٹولہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے مسلم لیگ کی صفوں میں گھس آیا اور اس طرح پاکستان کے سیاہ و سپید کا مالک بن بیٹھا۔ یہی وہ ٹولہ تھا

جس نے غلام محمد کو دستور ساز اسمبلی توڑنے پر مبارک بادی پیش کی اور جس نے سکندر مرزا جیسے عقل و فکر سے عاری شخص کے اشارے پر ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو کر مسلم لیگ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ اس مفاد پرست ٹولے نے فیلڈ مارشل محمد ایوب کے فوجی انقلاب کی بڑھ چڑھ کر پذیرائی کی اور اُسے ایک "عظیم رہنما" کے لقب سے ملقب کرتے ہوئے اس کی شان میں قصیدے پڑھنے شروع کیے فیلڈ مارشل صاحب فوجی انقلاب کے پہلے چند سال تو اس گروہ کی قصیدہ خوانی سُن سُن کر دل ہی دل میں خوش ہوتے رہے لیکن کچھ مدت گزرنے کے بعد انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مدح سرائی کرنے والوں کی اگر جتھہ بندی کر دی جائے تو ان سے قصیدہ خوانی کے علاوہ بعض دوسرے کام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لیے کنونشن مسلم لیگ کی بنیاد رکھی ، اور یہ مفاد پرست ٹولہ فوراً اس میں شامل ہو گیا اور فیلڈ مارشل صاحب کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اس راستے پر ڈال دیا جو نہ تو ان کے لیے اور نہ ملک و ملّت کے لیے خیر اور بھلائی کی راہ تھی۔ اس غلط راستے پر چلنے کے جب خوفناک نتائج کھل کر سامنے آنے لگے تو عوام میں بیزاری کی ایک عام لہر پیدا ہوئی، جس نے بالآخر ایک عوامی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ خود فیلڈ مارشل صاحب کو بھی اس امر کا احساس ہُوا کہ وہ عوام کے جمہوری حقوق سلب کر کے نہیں بلکہ اُن کی محافظت کر کے ملک و ملت کی بہتر طور پر خدمت کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اس احساس کے پیشِ نظر تمام سیاسی پارٹیوں کی گول میز کانفرنس طلب کی تاکہ ملک کو جمہوری راستے پر ڈال دیا جائے لیکن عین اس نازک مرحلے پر جب جمہوریت کی صبح طلوع ہونے والی تھی، آمرانہ عزائم رکھنے والے چند مخصوص طبقوں نے اس کانفرنس کو ناکام بنا دیا، جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ملک ایک مرتبہ پھر آمریت کی تاریکیوں میں بھٹکنے لگا۔

پاکستان میں آمریت کے مکمل تسلّط کی کوششوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ علاوہ اور بہت سے دوسرے اسباب کے ایک بڑا سبب جس کی بنا پر یہ کوششیں بار آور نہ ہو سکیں وہ پاکستان کے دو بازوؤں کا وجود تھا۔ آمریت کی کامیابی کا انحصار یُوں تو متعدد عوامل پر ہوتا ہے لیکن ایک چیز جو اس کے تسلط میں براہِ راست نہ سہی بلکہ بالواسطہ طور پر مُمِد و مُعاون ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ملک چھوٹا ہو اور سارا علاقہ ایک دوسرے سے ملحق ہو۔ درمیان میں کوئی دوسری حکومت حائل نہ ہو۔ پاکستان

چونکہ ایک ایسا وسیع و عریض ملک ہے جس کے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ ہے اس لیے آمریت بیک وقت پاکستان کے دونوں حصوں پر اپنا تسلط پوری طرح قائم کرنے میں ہمیشہ ناکام ہوئی۔ اس قسم کے پیہم ناکام تجربات کے بعد دونوں بازوؤں کے آمر اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب تک پاکستان کے ایک حصے کو کاٹ کر دوسرے سے بالکل الگ نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک آمریت کے تسلط کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس احساس کے بعد ہی ملک کے دونوں بازوؤں میں ایسی تحریکات نے جنم لیا جن کا مقصد ہی ملک کے حصے بخرے کرنا تھا۔ ان تحریکوں کے مزاج کا ہم جب مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں تین نمایاں خصوصیات پاتے ہیں:

(۱) ان تحریکات کی سربراہی ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو "اُدھر تم اور اِدھر ہم" کا نعرہ لے کر میدانِ عمل میں اُترے تھے۔

(۲) ان تحریکات کا خمیر ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات سے اٹھایا گیا تھا۔ جن لوگوں نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی ان تحریکوں کو شروع کیا انہوں نے عوام کے اندر اس باطل خیال کو راسخ کرنے کی کوشش کی کہ مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کا بُری طرح استحصال کر رہا ہے اس لیے جب تک مشرقی پاکستان کے لوگ مغربی پاکستان سے نجات حاصل نہیں کر لیتے اس وقت تک وہ استحصال سے بچ نہیں سکتے۔ اِدھر مغربی پاکستان میں عوام کے اندر یہ تاثر پھیلایا جا رہا تھا کہ مشرقی پاکستان مغربی خطے پر بوجھ بنا ہوا ہے وہ جب تک اس بوجھ کو اُتار نہیں پھینکتا اس وقت تک اس کی معیشت درست نہیں ہو سکتی۔

(۳) پھر ان تحریکات کے اثر و نفوذ اور دائرۂ کار کو بھی الگ الگ خطے تک محدود رکھا گیا تاکہ دونوں کے درمیان بُعد اور بیگانگی بڑھتی چلی جائے۔ پیپلز پارٹی کا سارا زور صرف مغربی پاکستان تک محدود تھا اور وہ بھی صرف دو صوبوں کی حد تک۔ عوامی لیگ کا مشرقی پاکستان میں چرچا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کی علاقائی تحریکوں کے زور پکڑنے اور عوام میں مقبول ہونے سے ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان اتحاد اور اتفاق کی راہ تو ہموار نہ ہو سکتی تھی بلکہ افتراق و انتشار کی قوتوں کو کام کرنے کے مواقع فراہم ہو رہے تھے۔

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

تفہیم القرآن

الھُمَزَہ

نام | پہلی آیت کے لفظ ھُمَزَہ کو اس سُورے کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | اس کے مکّی ہونے پر تمام مفسّرین کا اتفاق ہے۔ اور اس کے مضمون اور اندازِ بیان پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی مکّہ کے ابتدائی دَور میں نازل ہونے والی سُورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون | اِس میں چند ایسی اخلاقی بُرائیوں کی مذمّت کی گئی ہے جو جاہلیّت کے معاشرے میں زر پرست مالداروں کے اندر پائی جاتی تھیں، جنہیں ہر عرب جانتا تھا کہ یہ بُرائیاں فی الواقع اُس کے معاشرے میں موجود ہیں، اور جن کو سب ہی بُرا سمجھتے تھے، کسی کا بھی یہ خیال نہ تھا کہ یہ کوئی خوبیاں ہیں۔ اِس گھناؤنے کردار کو پیش کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت میں اُن لوگوں کا کیا انجام ہو گا جن کا یہ کردار ہے۔ یہ دونوں باتیں (یعنی ایک طرف یہ کردار اور دوسری طرف آخرت میں اُس کا یہ انجام) ایسے انداز سے بیان کی گئی ہیں جس سے سامع کا ذہن خود بخود اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ اِس طرح کے کردار کا یہی انجام ہونا چاہیے، اور چونکہ دنیا میں ایسے کردار والوں کو کوئی سزا نہیں ملتی، بلکہ وہ پھلتے پھولتے ہی نظر آتے ہیں، اِس لیے آخرت کا برپا ہونا قطعی ناگزیر ہے۔

اِس سُورۃ کو اگر اُن سُورتوں کے تسلسُل میں رکھ کر دیکھا جائے جو سُورۂ زِلزال سے یہاں تک چلی آ رہی ہیں تو آدمی بڑی اچھی طرح یہ سمجھ سکتا ہے کہ مکّۂ معظّمہ کے ابتدائی دَور میں کس طریقہ سے اسلام کے عقائد اور اُس کی اخلاقی تعلیمات کو لوگوں کے ذہن نشین کیا گیا تھا۔ سُورۂ زلزال میں بتایا گیا کہ آخرت میں انسان کا پُورا نامۂ اعمال اُس کے سامنے رکھ دیا جائیگا

اور کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہ ہوگی جو اس نے دنیا میں کی ہو اور وہ وہاں اس کے سامنے نہ آجائے۔ سورۃ عادیات میں اُس لوٹ مار، کشت وخون اور غارت گری کی طرف اشارہ کیا گیا جو عرب میں ہر طرف برپا تھی، پھر یہ احساس دلانے کے بعد کہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں کا یہ استعمال اُس کی بہت بڑی ناشکری ہے، لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ معاملہ اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جائے گا، بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی میں تمہارے افعال ہی کی نہیں، تمہاری نیتوں تک کی جانچ پڑتال کی جائے گی اور تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون آدمی کس سلوک کا مستحق ہے۔ سورۃ قارعہ میں قیامت کا نقشہ پیش کرنے کے بعد لوگوں کو خبردار کیا گیا کہ آخرت میں انسان کے اچھے یا بُرے انجام کا انحصار اِس پر ہوگا کہ اُس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا ہلکا۔ سورۃ تکاثر میں اس مادہ پرستانہ ذہنیت پر گرفت کی گئی جس کی وجہ سے لوگ مرتے دم تک بس دنیا کے فائدے اور لذتیں اور عیش و آرام اور جاہ و منزلت زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، پھر اس غفلت کے بُرے انجام سے آگاہ کر کے لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ دُنیا کوئی خوانِ یغما نہیں ہے کہ اُس پر تم جتنا اور جس طرح چاہو ہاتھ مارو، بلکہ ایک ایک نعمت جو یہاں تمہیں مل رہی ہے اس کے لیے تمہیں اپنے رب کو جواب دینا ہوگا کہ اسے تم نے کیسے حاصل کیا، اور حاصل کر کے اس کو کس طرح استعمال کیا۔ سورۃ عصر میں بالکل دو ٹوک طریقے سے بتا دیا گیا کہ نوعِ انسانی کا ایک ایک فرد، ایک ایک گروہ، ایک ایک قوم، حتیٰ کہ پوری دنیائے انسانیت خسارے میں ہے اگر اُس کے افراد میں ایمان و عملِ صالح نہ ہو اور اس کے معاشرے میں حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کا رواج عام نہ ہو۔ اِس کے معاً بعد سورۃ ھمزہ آتی ہے جس میں جاہلیت کی سرداری کا ایک نمونہ پیش کر کے لوگوں کے سامنے گویا یہ سوال رکھ دیا گیا کہ یہ کردار آخر خسارے کا موجب کیوں نہ ہو؟

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو (مُنہ در مُنہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) بُرائیاں کرنے کا خوگر ہے۔[1] جس نے مال جمع کیا اور اُسے گِن گِن کر رکھا۔[2] وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔[3] ہرگز نہیں، وہ شخص تو چکنا چُور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا۔[4] اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ

---

۱ اصل الفاظ ہیں ھُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ۔ عربی زبان میں ہَمز اور لَمز لغت کے اعتبار سے باہم اتنے قریب ہیں کہ کبھی دونوں ہم معنی استعمال ہوتے ہیں، اور کبھی دونوں میں فرق ہوتا ہے، مگر ایسا فرق کہ خود اہل زبان ہی میں سے کچھ لوگ ہَمز کا جو مفہوم بیان کرتے ہیں، کچھ دوسرے لوگ وہی مفہوم لَمز کا بیان کرتے ہیں، اور اس کے برعکس کچھ لوگ لَمز کے جو معنی بیان کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کے نزدیک ہَمز کے معنی ہیں۔ یہاں چونکہ دونوں لفظ ایک ساتھ آئے ہیں اور ھُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اس لیے دونوں مل کر یہ معنی دیتے ہیں کہ اُس شخص کی عادت ہی یہ بن گئی ہے کہ وہ دوسروں کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے، کسی کو دیکھ کر انگلیاں اٹھاتا اور آنکھوں سے اشارے کرتا ہے، کسی کے نسب پر طعن کرتا ہے، کسی کی ذات میں کیڑے نکالتا ہے، کسی پر مُنہ در مُنہ چوٹیں کرتا ہے، کسی کے پیٹھ پیچھے اُس کی بُرائیاں کرتا ہے، کہیں چغلیاں کھا کر اور لگائی بجھائی کر کے دوستوں کو لڑواتا اور کہیں بھائیوں میں پھوٹ ڈلواتا ہے، لوگوں کے بُرے بُرے نام رکھتا ہے، اُن پر چوٹیں کرتا ہے اور اُن کو عیب لگاتا ہے۔

۲ پہلے فقرے کے بعد یہ دوسرا فقرہ خود بخود یہ معنی دیتا ہے کہ لوگوں کی یہ تحقیر و تذلیل وہ اپنی مالداری کے غرور میں کرتا ہے۔ مال جمع کرنے کے لیے جَمَعَ مَالًا کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے مال کی کثرت کا مفہوم نکلتا ہے۔ پھر گِن گِن کر رکھنے کے الفاظ سے اُس شخص کے بخل اور زر پرستی کی تصویر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

۳ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ سمجھتا ہے اُس کا مال اُسے حیاتِ جاوداں بخش دے گا، یعنی دولت جمع کرنے اور اُسے گِن گِن کر رکھنے میں وہ ایسا منہمک ہے کہ اُسے اپنی موت یاد نہیں رہی ہے اور اسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ایک وقت اُس کو یہ سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہو جانا پڑے گا۔

۴ اصل میں لفظ حُطَمَہ استعمال کیا گیا ہے جو حَطْم سے ہے۔ حَطْم کے معنی توڑنے، کچل دینے اور

چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ[۶]، خوب بھڑکائی ہوئی، جو دلوں تک پہنچے گی[۷]۔ وہ اُن پر
ڈھانک کر بند کر دی جائے گی[۸] (اِس حالت میں کہ وہ) اُونچے اُونچے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے)[۹]۔ ع ۱

ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کے ہیں۔ جہنّم کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ جو چیز بھی اُس میں پھینکی جائے گی اُسے وہ اپنی گہرائی اور اپنی آگ کی وجہ سے توڑ کر رکھ دے گی۔

۵ اصل میں لَیُنۡبَذَنَّ فرمایا گیا ہے۔ نَبۡذ عربی زبان میں کسی چیز کو بے وقعت اور حقیر سمجھ کر پھینک دینے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اِس سے خود بخود یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اپنی مال داری کی وجہ سے وہ دنیا میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہے، لیکن قیامت کے روز اُسے حقارت کے ساتھ جہنّم میں پھینک دیا جائے گا۔

۶ قرآنِ مجید میں اِس مقام کے سوا اور کہیں جہنّم کی آگ کو اللہ کی آگ نہیں کہا گیا ہے۔ اِس مقام پر اُس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے سے نہ صرف اُس کی ہولناکی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی دولت پا کر غرور و تکبّر میں مبتلا ہو جانے والوں کو اللہ کس قدر سخت نفرت اور غضب کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس کی وجہ سے اُس نے اُس آگ کو خاص اپنی آگ کہا ہے جس میں وہ پھینکے جائیں گے۔

۷ اصل الفاظ ہیں تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡئِدَةِ۔ تَطَّلِعُ اِطِّلاع سے ہے جس کے ایک معنی چڑھنے اور اُوپر پہنچ جانے کے ہیں، اور دوسرے معنی باخبر ہونے اور اطلاع پانے کے۔ اَفۡئِدَہ فُؤاد کی جمع ہے جس کے معنی دل کے ہیں، لیکن یہ لفظ اُس عضو کے لیے استعمال نہیں ہوتا جو سینے کے اندر دھڑکتا ہے، بلکہ اُس مقام کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسان کے شعور و ادراک، اور جذبات و خواہشات، اور عقائد و افکار، اور نیتوں اور ارادوں کا مقام ہے۔ دلوں تک اس آگ کے پہنچنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ آگ اُس جگہ تک پہنچے گی جو انسان کے بُرے خیالات، فاسد عقائد، ناپاک خواہشات و جذبات، اور خبیث نیّتوں اور ارادوں کا مرکز ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وہ آگ دنیا کی آگ کی طرح اندھی نہیں ہو گی کہ مستحق اور غیر مستحق سب کو جلا دے بلکہ وہ ایک ایک مجرم کے دل تک پہنچ کر اس کے جرم کی نوعیت معلوم کریگی اور ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق عذاب دیگی۔

۸ یعنی جہنّم میں مجرموں کو ڈال کر اُوپر سے اُس کو بند کر دیا جائیگا۔ کوئی دروازہ تو درکنار کوئی جھری تک کھُلی ہوئی نہ ہو گی۔

۹ فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جہنّم کے دروازوں کو بند کر کے اُن پر اُونچے اُونچے ستون گاڑ دیے جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ مجرم اُونچے اُونچے ستونوں سے بندھے ہوئے ہونگے۔ تیسرا مطلب ابن عباسؓ نے یہ بیان کیا ہے کہ اُس آگ کے شعلے لمبے لمبے ستونوں کی شکل میں اُٹھ رہے ہونگے۔

تفہیم القرآن

الفیل

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اصحاب الفیل سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورۃ بالاتفاق مکی ہے۔ اور اس کے تاریخی پس منظر کو اگر نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نزول مکہ معظمہ کے بھی ابتدائی دور میں ہوا ہوگا۔

تاریخی پس منظر اس سے پہلے تفسیر سورۂ بروج حاشیہ ۴ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ نجران میں یمن کے یہودی فرمانروا ذُونُواس نے پیروانِ مسیح علیہ السلام پر جو ظلم کیا تھا اُس کا بدلہ لینے کے لیے حبش کی عیسائی سلطنت نے یمن پر حملہ کر کے حمیری حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور ۵۲۵ء میں اِس پورے علاقے پر حبشی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ یہ ساری کارروائی دراصل قسطنطنیہ کی رومی سلطنت اور حبش کی حکومت کے باہمی تعاون سے ہوئی تھی، کیونکہ حبشیوں کے پاس اُس زمانے میں کوئی قابلِ ذکر بحری بیڑا نہ تھا۔ بیڑا رومیوں نے فراہم کیا اور حبش نے اپنی ۷۰ ہزار فوج اسی کے ذریعہ سے یمن کے ساحل پر اتاری۔ آگے کے معاملات سمجھنے کے لیے یہ بات ابتدا ہی میں جان لینی چاہیے کہ یہ سب کچھ محض مذہبی جذبے سے نہیں ہوا تھا بلکہ اِس کے پیچھے معاشی و سیاسی اغراض بھی کام کر رہی تھیں، بلکہ غالباً وہی اِس کی اصل محرک تھیں اور عیسائی مظلومین کے خون کا انتقام ایک بہانے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ رومی سلطنت جب سے مصر و شام پر قابض ہوئی تھی اُسی وقت سے اُس کی یہ کوشش تھی کہ مشرقی افریقہ، ہندوستان، انڈونیشیا وغیرہ ممالک اور رومی مقبوضات کے درمیان جس تجارت پر عرب صدیوں سے قابض چلے آرہے تھے، اُسے عربوں کے قبضے سے نکال کر وہ خود اپنے قبضے میں لے لے، تاکہ اُس کے منافع پورے

سکے پورے اُسی کو حاصل ہوں اور عرب تاجروں کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے۔ اِس مقصد کے لیے ۲۴ء یا ۲۵ء قبلِ مسیح میں قیصر آگسٹس نے ایک بڑی فوج رومی جنرل ایلیس گالوس (AELIUS GALLUS) کی قیادت میں عرب کے مغربی ساحل پر اتار دی تھی تاکہ وہ اُس بحری راستے پر قابض ہو جائے جو جنوبی عرب سے شام کی طرف جاتا تھا۔ (اس شاہراہ کا نقشہ ہم نے تفہیم القرآن، جلد دوم میں صفحہ ۴۲ پر درج کیا ہے)۔ لیکن عرب کے شدید جغرافی حالات نے اِس مہم کو ناکام کر دیا۔ اس کے بعد رومی اپنا جنگی بیڑہ بحرِ احمر میں لے آئے اور انہوں نے عربوں کی اُس تجارت کو ختم کر دیا جو وہ سمندر کے راستے کرتے تھے، اور صرف بری راستہ اُن کے لیے باقی رہ گیا۔ اِسی بری راستے کو قبضے میں لینے کے لیے اُنہوں نے حبش کی عیسائی حکومت سے گٹھ جوڑ کیا اور بحری بیڑے سے اُس کی مدد کر کے اُس کو یمن پر قابض کرا دیا۔

یمن پر جو حبشی فوج حملہ آور ہوئی تھی اس کے متعلق عرب مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں۔ حافظ ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ وہ دو امیروں کی قیادت میں تھی، ایک اَریاط، دوسرا اَبرہہ۔ اور محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس فوج کا امیر اریاط تھا، اور اَبرہہ اس میں شامل تھا۔ پھر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ابرہہ اور اریاط باہم لڑ پڑے، مقابلے میں اریاط مارا گیا، ابرہہ ملک پر قابض ہو گیا اور پھر اُس نے شاہِ حبش کو اِس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اُسی کو یمن پر اپنا نائب مقرر کر دے۔ اِس کے برعکس یونانی اور سریانی مؤرخین کا بیان ہے کہ فتحِ یمن کے بعد جب حبشیوں نے مزاحمت کرنے والے یمنی سرداروں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دیا تو اُن میں سے ایک سردار السُّمَیفَع اَشْوَع (جسے یونانی مؤرخین ESYMPHAEUS لکھتے ہیں) نے حبشیوں کی اطاعت قبول کر کے اور جزیہ ادا کرنے کا عہد کر کے شاہ حبش سے یمن کی گورنری کا پروانہ حاصل کر لیا۔ لیکن حبشی فوج نے اُس کے خلاف بغاوت کر دی اور ابرہہ کو اس کی جگہ گورنر بنا دیا۔ یہ شخص حبش کی بندرگاہ اَدُولیس کے ایک یونانی تاجر کا غلام تھا جو اپنی ہوشیاری سے یمن پر قبضہ کرنے والی حبشی فوج میں بڑا اثر و رسوخ حاصل کر گیا تھا۔ شاہ حبش نے اس کی سرکوبی کے لیے جو فوجیں بھیجیں وہ یا اس سے مل گئیں یا اس نے ان کو شکست دے دی۔ آخر کار شاہ حبش کے مرنے کے بعد اُس کے جانشین نے اس کو یمن پر اپنا نائب السلطنت تسلیم کر لیا (یونانی مؤرخین اس کو ابراہس

ABRAMES اور سُریانی مؤرخین ابراہام ABRAHAM لکھتے ہیں۔ ابرہہ غالباً اسی کا حبشی تلفظ ہے)۔

یہ شخص رفتہ رفتہ یمن کا خود مختار بادشاہ بن گیا، مگر برائے نام اس نے شاہ حبش کی بالادستی تسلیم کر رکھی تھی اور اپنے آپ کو مُفَوَّض المَلِک (نائب شاہ) لکھتا تھا۔ اُس نے جو اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا اُس کا اندازہ اِس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ۵۴۳ء میں وہ سدِّ مارِب کی مرمّت سے فارغ ہوا تو اس نے ایک عظیم الشان جشن منایا جس میں قیصرِ روم، شاہِ ایران، شاہِ حیرَہ اور شاہِ غَسّان کے سُفرا شریک ہوئے۔ اِس کا مفصل تذکرہ اُس کتبے میں درج ہے جو ابرہہ نے سدِّ مارب پر لگایا تھا۔ یہ کتبہ آج بھی موجود ہے اور گلیزر (GLASER) نے اس کو نقل کیا ہے (مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ سبا، حاشیہ ۳۷)۔

یمن میں پوری طرح اپنا اقتدار مضبوط کر لینے کے بعد ابرہہ نے اُس مقصد کے لیے کام شروع کر دیا جو اس مہم کی ابتدا سے رومی سلطنت اور اُس کے حلیف حبشی عیسائیوں کے پیشِ نظر تھا، یعنی ایک طرف عرب میں عیسائیت پھیلانا اور دوسری طرف اُس تجارت پر قبضہ کرنا جو بلادِ مشرق اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ یہ ضرورت اِس بنا پر اور بڑھ گئی تھی کہ ایران کی ساسانی سلطنت کے ساتھ روم کی کشمکشِ اقتدار نے بلادِ مشرق سے رومی تجارت کے دوسرے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ ابرہہ نے اس مقصد کے لیے یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کرایا جس کا ذکر عرب مؤرخین نے اَلقَلِیس یا اَلقُلَّیس یا اَلقُلَّیس کے نام سے کیا ہے (یہ یونانی لفظ EKKLESIA کا معرّب ہے اور اردو کا لفظ کلیسا بھی اسی یونانی لفظ سے ماخوذ ہے)۔ محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس کام کی تکمیل کے بعد اُس نے شاہِ حبش کو لکھا کہ میں عربوں کا حج کعبہ سے اِس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا[1]۔ ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ اُس نے

---

[1] یمن پر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد عیسائیوں کی مسلسل یہ کوشش رہی کہ کعبہ کے مقابلے میں ایک دوسرا کعبہ بنائیں اور عرب میں اُس کی مرکزیت قائم کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے نجران میں بھی ایک کعبہ بنایا تھا جس کا ذکر ہم سُورۂ بروج حاشیہ ۴ میں کر چکے ہیں۔

یمن میں علی الاعلان اپنے اس ارادے کا اظہار کیا اور اس کی منادی کرا دی۔ اُس کی اس حرکت کا مقصد ہمارے نزدیک یہ تھا کہ عربوں کو غصّہ دلائے تاکہ وہ کوئی ایسی کارروائی کریں جس سے اُس کو مکّہ پر حملہ کرنے اور کعبے کو منہدم کر دینے کا بہانہ مل جائے۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ اُس کے اس اعلان پر غضبناک ہو کر ایک عرب نے کسی نہ کسی طرح کلیسا میں گھُس کر رفعِ حاجت کر ڈالی۔ ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ یہ فعل ایک قریشی نے کیا تھا۔ اور مُقاتِل بن سُلیمان کی روایت ہے کہ قریش کے بعض نوجوانوں نے جا کر اس کلیسا میں آگ لگا دی تھی۔ اِن میں سے کوئی واقعہ بھی اگر پیش آیا ہو تو کوئی قابلِ تعجب امر نہیں ہے، کیونکہ ابرہہ کا یہ اعلان یقیناً سخت اشتعال انگیز تھا اور قدیم جاہلیت کے دور میں اس پر کسی عرب، یا قریشی کا، یا چند قریشی نوجوانوں کا مشتعل ہو کر کلیسا کو گندا کر دینا یا اس میں آگ لگا دینا کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ابرہہ نے خود اپنے کسی آدمی سے خفیہ طور پر ایسی کوئی حرکت کرائی ہو تاکہ اُسے مکّہ پر چڑھائی کرنے کا بہانہ مل جائے اور اس طرح وہ قریش کو تباہ اور تمام اہلِ عرب کو مرعوب کر کے اپنے دونوں مقصد حاصل کر لے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، جب ابرہہ کے پاس یہ رپورٹ پہنچی کہ کعبے کے معتقدین نے اس کے کلیسا کی یہ توہین کی ہے تو اس نے قسم کھائی کہ مَیں اُس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک کعبے کو ڈھا نہ دوں۔

اِس کے بعد وہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں ۶۰ ہزار فوج اور ۱۳ ہاتھی (اور بروایت بعض ۹ ہاتھی) لے کر مکّہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں پہلے یمن کے ایک سردار ذُونَفَر نے عربوں کا ایک لشکر جمع کر کے اس کی مزاحمت کی، مگر وہ شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔ پھر خَثعم کے علاقے میں ایک عرب سردار نُفَیل بن حبیب خَثعمی اپنے قبیلے کو لے کر مقابلے پر آیا، مگر وہ بھی شکست کھا کر گرفتار ہو گیا اور اس نے اپنی جان بچانے کے لیے بدرقے کی خدمت انجام دینا قبول کر لیا۔ طائف کے قریب پہنچا تو بنی ثَقیف نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی طاقت کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے، اور ان کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ اُن کے معبود لات کا مندر بھی تباہ نہ کر دے۔ چنانچہ اُن کا سردار مسعود ایک وفد لے کر ابرہہ سے ملا اور اس نے کہا کہ ہمارا بُت کدہ وہ معبد نہیں ہے جسے آپ ڈھانے آئے ہیں، وہ تو مکّہ میں ہے، اس لیے آپ ہمارے معبد کو چھوڑ دیں، ہم مکّہ کا راستہ بتانے کے لیے آپ کو بدرقہ فراہم کیے دیتے ہیں۔ ابرہہ نے یہ بات قبول کر لی اور بنی ثقیف نے ابو رِغال نامی ایک آدمی کو اس

کے ساتھ کر دیا۔ جب مکّہ تین کوس رہ گیا تو المُغَمَّس (یا المُغَمِّس) نامی مقام پر پہنچ کر ابورغال مرگیا اور عرب مدّتوں تک اس کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے۔ بنی ثقیف کو بھی وہ سالہا سال تک طعنے دیتے رہے کہ انہوں نے لات کے مندر کو بچانے کے لیے بیت اللہ پر حملہ کرنے والوں سے تعاون کیا۔

محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ المغمس سے ابرہہ نے اپنے مقدمۃ الجیش کو آگے بڑھایا اور وہ اہلِ تہامہ اور قریش کے بہت سے مویشی لوٹ لے گیا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمُطّلب کے بھی دو سو اونٹ تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک ایلچی کو مکّہ بھیجا اور اس کے ذریعہ سے اہلِ مکّہ کو یہ پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں بلکہ اس گھر (کعبہ) کو ڈھانے آیا ہوں۔ اگر تم نہ لڑو تو میں تمہاری جان و مال سے کوئی تعرّض نہ کروں گا۔ نیز اس نے اپنے ایلچی کو ہدایت کی کہ اہلِ مکّہ اگر بات کرنا چاہیں تو اُن کے سردار کو میرے پاس لے آنا۔ مکّے کے سب سے بڑے سردار اُس وقت عبدالمطلب تھے۔ ایلچی نے ان سے مل کر ابرہہ کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے کہا کہ ہم میں ابرہہ سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ یہ اللہ کا گھر ہے۔ وہ چاہے گا تو اپنے گھر کو بچائے گا۔ ایلچی نے کہا کہ آپ میرے ساتھ ابرہہ کے پاس چلیں۔ وہ اس پر راضی ہو گئے اور اس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ اس قدر وجیہ اور شاندار شخص تھے کہ اُن کو دیکھ کر ابرہہ بہت متاثر ہوا اور اپنے تخت سے اُتر کر ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے جو اونٹ پکڑ لیے گئے ہیں وہ مجھے واپس دے دیے جائیں۔ ابرہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں بہت متاثر ہوا تھا، مگر آپ کی اِس بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا کہ آپ اپنے اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ گھر جو آپ کا اور آپ کے دینِ آبائی کا مرجع ہے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ انہوں نے کہا میں تو صرف اپنے اونٹوں کا مالک ہوں اور انہی کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ رہا یہ گھر، تو اس کا ایک رب ہے، وہ اِس کی حفاظت خود کرے گا۔ ابرہہ نے جواب دیا وہ اس کو مجھ سے نہ بچا سکے گا۔ عبدالمطلب نے کہا آپ جانیں اور وہ جانے۔ یہ کہہ کر وہ ابرہہ کے پاس سے اُٹھ آئے اور اُس نے اُن کے اونٹ واپس کر دیے۔

ابنِ عباسؓ کی روایت اِس سے مختلف ہے۔ اُس میں اونٹوں کے مطالبے کا کوئی ذکر نہیں

ہے۔ عبد بن حُمید، ابن المُنذر، ابن مَردُوْیہ، حاکم، ابو نُعیم اور بَیہقی نے اُن سے جو روایات نقل کی ہیں اُن میں وہ بیان کرتے ہیں کہ جب ابرہہ الصِفاح کے مقام پر پہنچا (جو عرفات اور طائف کے پہاڑوں کے درمیان حدودِ حرم کے قریب واقع ہے)، تو عبدالمطلب خود اُس کے پاس گئے اور اس سے کہا آپ کو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کو اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجتے، ہم خود لے کر آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ یہ گھر امن کا گھر ہے، میں اس کا امن ختم کرنے آیا ہوں۔ عبدالمطلب نے کہا یہ اللہ کا گھر ہے، آج تک اُس نے کسی کو اس پر مسلط نہیں ہونے دیا ہے۔ ابرہہ نے جواب دیا ہم اسے منہدم کیے بغیر نہ پلٹیں گے۔ عبدالمطلب نے کہا آپ جو کچھ چاہیں ہم سے لے لیں اور واپس چلے جائیں۔ مگر ابرہہ نے انکار کر دیا اور عبدالمطلب کو پیچھے چھوڑ کر اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

دونوں روایتوں کے اِس اختلاف کو اگر ہم اپنی جگہ رہنے دیں اور کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیں تو ان میں سے جو صورت بھی پیش آئی ہو، بہرحال یہ امر بالکل واضح ہے کہ مکہ اور اس کے آس پاس کے قبائل اتنی بڑی فوج سے لڑ کر کعبے کو بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے یہ بالکل قابلِ فہم بات ہے کہ قریش نے اُس کی مزاحمت کی کوئی کوشش نہ کی۔ قریش کے لوگ تو جنگِ احزاب کے موقع پر مشرک اور یہودی قبائل کو ساتھ ملا کر زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار کی جمعیت فراہم کر سکے تھے۔ وہ ۶۰ ہزار فوج کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔

محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ ابرہہ کی لشکر گاہ سے واپس آکر عبدالمطلب نے قریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں تاکہ ان کا قتلِ عام نہ ہو جائے۔ پھر وہ اور قریش کے چند سردار حرم میں حاضر ہوئے اور کعبے کے دروازے کا کنڈا پکڑ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اُس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اُس وقت خانۂ کعبہ میں ۳۶۰ بُت موجود تھے، مگر یہ لوگ اُس نازک گھڑی میں اُن سب کو بھول گئے اور انہوں نے صرف اللہ کے آگے دستِ سوال پھیلایا۔ اُن کی جو دعائیں تاریخوں میں منقول ہوئی ہیں ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ ابنِ ہشام نے سیرت میں عبدالمطلب کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں:

لا هُمَّ ان العبد يمنع رحله فامنع حِلالك

خدایا! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔

لا يغلبنّ صليبهم ومحالهم غدواً محالك

کل اُن کی صلیب اور اُن کی تدبیر تیری تدبیر کے مقابلے میں غالب نہ آنے پائے۔

ان كنت تاركهم وقبلتنا فامر ما بدا لك

اگر تو ان کو اور ہمارے قبلے کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہتا ہے تو جو تو چاہے کر۔

سُہیلی نے روض الانف میں اس سلسلے کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے:

وانصر على آل الصليب وعابديه اليوم آلك

صلیب کی آل اور اس کے پرستاروں کے مقابلے میں آج اپنی آل کی مدد فرما۔

ابن جریر نے عبدالمطّلب کے یہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جو اس موقع پر دعا مانگتے ہوئے انہوں نے پڑھے تھے:

يا ربِّ لا ارجو لهم سواكا يا ربِّ فامنع منهم حِماكا

اے میرے رب تیرے سوا میں اُن کے مقابلے میں کسی سے اُمید نہیں رکھتا۔ اے میرے رب ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر۔

ان عدوّ البيت من عاداكا امنعهم ان يخربوا قراكا

اِس گھر کا دشمن تیرا دشمن ہے۔ اپنی بستی کو تباہ کرنے سے ان کو روک۔

یہ دعائیں مانگ کر عبدالمطلب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں میں چلے گئے، اور دوسرے روز ابرہہ مکے میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا۔ مگر اُس کا خاص ہاتھی محمود، جو آگے آگے تھا یکایک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تبر مارے گئے، آنکسوں سے کچوکے دیئے گئے، یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا گیا، مگر وہ نہ ہلا۔ اُسے جنوب، شمال، مشرق کی طرف موڑ کر چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ دوڑنے لگتا، مگر مکے کی طرف موڑا جاتا تو وہ فوراً بیٹھ جاتا اور کسی طرح آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اتنے میں پرندوں کے جھُنڈ کے جھُنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے بحرِ احمر کی طرف سے آئے اور انہوں نے اس لشکر پر سنگریزوں کی بارش کر دی جس پر بھی یہ کنکر گرتے اُس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا محمد بن اسحاق اور عکرمہ کی روایت ہے کہ یہ

چیچک کا مرض تھا اور بلادِ عرب میں سب سے پہلے چیچک اسی سال دیکھی گئی۔ ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ جس پر کوئی کنکری گرتی اسے سخت کھُجلی لاحق ہو جاتی اور کھُجاتے ہی جِلد پھٹتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا۔ ابنِ عباس کی دوسری روایت یہ ہے کہ گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور ہڈیاں نکل آتی تھیں۔ خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا اور جہاں سے کوئی ٹکڑا گرتا وہاں سے پیپ اور لہو بہنے لگتا۔ افراتفری میں ان لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ نُفَیل بن حبیب خَثْعمی کو، جسے یہ لوگ بَدرَقہ بنا کر بلادِ خَثْعَم سے پکڑ لائے تھے، تلاش کر کے انہوں نے کہا کہ واپسی کا راستہ بتائے۔ مگر اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا:

این المفر والالٰہ الطالب والاشرم المغلوب لیس الغالب

اب بھاگنے کی جگہ کہاں ہے جبکہ خدا تعاقب کر رہا ہے اور نکٹا (ابرہہ) مغلوب ہے، غالب نہیں ہے۔

اس بھگدڑ میں جگہ جگہ یہ لوگ گر گر کر مرتے رہے۔ عطاء بن یَسار کی روایت ہے کہ سب کے سب اُسی وقت ہلاک نہیں ہو گئے، بلکہ کچھ تو وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے بھر گرتے چلے گئے۔ ابرہہ بھی بلادِ خَثْعَم پہنچ کر مرا[1]۔

یہ واقعہ مُزْدَلِفَہ اور مِنٰی کے درمیان وادیٔ مُحَصَّب کے قریب مُحَسِّر کے مقام پر پیش آیا تھا۔ صحیح مسلم اور ابوداؤد کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حَجَّۃُ الوداع کا جو قصہ امام جعفر صادق نے اپنے والد ماجد امام محمد الباقر سے اور انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے اس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مُزْدَلِفَہ سے مِنٰی کی طرف چلے تو مُحَسِّر کی وادی میں آپ نے رفتار تیز کر دی۔ امام نَوَوِی اس

---

[1] اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو صرف یہی سزا دینے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ تین چار سال کے اندر یمن سے حبشی اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ فیل کے بعد یمن میں اُن کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی، جگہ جگہ یمنی سردار علمِ بغاوت لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے، پھر ایک یمنی سردار سیف بن ذِی یَزَن نے شاہِ ایران سے فوجی مدد طلب کر لی اور ایران کی صرف ایک ہزار فوج جو چھ جہازوں کے ساتھ آئی تھی، حبشی حکومت کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی ہو گئی۔ یہ ۵۷۵ء کا واقعہ ہے۔

کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصحاب الفیل کا واقعہ اسی جگہ پیش آیا تھا، اس لیے سنت یہی ہے کہ آدمی یہاں سے جلدی گزر جائے۔ مؤطا میں امام مالک روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مزدلفہ پورا کا پورا ٹھیرنے کا مقام ہے، مگر محسّر کی وادی میں نہ ٹھیرا جائے نُفیل بن حبیب کے جو اشعار ابن اسحاق نے نقل کیے ہیں ان میں وہ اِس واقعہ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا ہے۔

رُدَینۃُ لو رأیتِ ولا تَریہ لدیٰ جنب المحصّب ما رأینا

اے رُدَینہ کاش تو دیکھتی، اور تو نہیں دیکھ سکے گی جو کچھ ہم نے وادیٔ محصّب کے قریب دیکھا۔

حمدتُ اللہ اذ ابصرت طیرًا وخفت حجارۃ تلقیٰ علینا

میں نے اللہ کا شکر کیا جب مَیں نے پرندوں کو دیکھا اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں پتھر ہم پر نہ آپڑیں۔

وکل القوم یسأل عن نفیل کأنّ علی للحبشان دَینا

ان لوگوں میں سے ہر ایک نُفیل کو ڈھونڈ رہا تھا، گویا کہ میرے اُوپر حبشیوں کا کوئی قرض آتا تھا۔

یہ اتنا بڑا واقعہ تھا جس کی تمام عرب میں شہرت ہوگئی اور اس پر بہت سے شعراء نے قصائد کہے۔ ان قصائد میں یہ بات بالکل نمایاں ہے کہ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعجاز قرار دیا اور کہیں اشارۃً وکنایۃً بھی یہ نہیں کہا کہ اس میں اُن بتوں کا بھی کوئی دخل تھا جو کعبہ میں پُوجے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر عبداللہ ابن الزِبَعْرَیٰ کہتا ہے:

ستون الفًا لم یؤبوا ارضہم ولم یعش بعد الایاب سقیمہا

۶۰ ہزار تھے جو اپنی سرزمین کی طرف واپس نہ جا سکے اور نہ واپس ہونے کے بعد ان کا بیمار (ابرہہ) زندہ رہا۔

کانت بہا عاد وجرھم قبلہم واللہ من فوق العباد یقیمہا

یہاں ان سے پہلے عاد اور جُرہُم تھے۔ اور اللہ بندوں کے اوپر موجود ہے جو اسے قائم رکھے ہوئے ہے

ابو قیس بن اَسلَت کہتا ہے:

فقوموا فصلّوا ربّکم وتمسّحوا بارکان ھٰذا البیت بین الاخاشب

اُٹھو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور مکہ و منیٰ کی پہاڑیوں کے درمیان بیت اللہ کے کونوں کو مس کرو

فلمّا اتاکم نصرُ ذی العرش ردّھم جنود الملیک بین ساف وحاصب

جب عرش والے کی مدد تمہیں پہنچی تو اس بادشاہ کے لشکروں نے ان لوگوں کو اس حال میں پھیر دیا کہ کوئی خاک میں پڑا تھا اور کوئی سنگسار کیا ہوا تھا۔

یہی نہیں بلکہ حضرت اُمِّ ھانی اور حضرت زُبیر بن العوّام کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قریش نے ۱۰ سال (اور بروایت بعض سات سال) تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ اُمّ ہانی کی روایت امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں اور طبرانی، حاکم، ابن مَردُویہ اور بیہقی نے اپنی کتبِ حدیث میں نقل کی ہے۔ حضرت زُبیر کا بیان طبرانی اور ابن مَردُویہ اور ابنِ عساکر نے روایت کیا ہے۔ اور اس کی تائید مزید حضرت سعید بن المُسَیّب کی اس مُرسَل روایت سے ہوتی ہے جو خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں درج کی ہے۔

جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اہلِ عرب اُسے عام الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہتے ہیں، اور اُسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ محدّثین اور مؤرخین کا اس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ محرّم میں پیش آیا تھا اور حضورؐ کی ولادت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی۔ اکثریت یہ کہتی ہے کہ آپ کی ولادت واقعۂ فیل کے ۵۰ دن بعد ہوئی۔

مقصودِ کلام | جو تاریخی تفصیلات اوپر درج کی گئی ہیں ان کو نگاہ میں رکھ کر سورۂ فیل پر غور کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس سورہ میں اس قدر اختصار کے ساتھ صرف اصحاب الفیل پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کر دینے پر کیوں اکتفا کیا گیا ہے۔ واقعہ کچھ بہت پرانا نہ تھا۔ مکّے کا بچہ بچہ اس کو جانتا تھا۔ عرب کے لوگ عام طور پر اس سے واقف تھے۔ تمام اہلِ عرب اس بات کے قائل تھے کہ ابرہہ کے اس حملے سے کعبے کی حفاظت کسی دیوی یا دیوتا نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ اللہ ہی سے قریش کے سرداروں نے مدد کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ اور چند سال تک قریش کے لوگ اس واقعہ سے اس قدر متاثر رہے تھے کہ انہوں نے اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی تھی۔ اس لیے سورۂ فیل میں ان تفصیلات

کے ذکر کی حاجت نہ تھی، بلکہ صرف اِس واقعے کو یاد دلانا کافی تھا، تاکہ قُریش کے لوگ خصوصًا، اور اہلِ عرب عمومًا، اپنے دلوں میں اس بات پر غور کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمام دوسرے معبودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جائے، نیز وہ یہ بھی سوچ لیں کہ اگر اِس دعوتِ حق کو دبانے کے لیے اُنہوں نے زور زبردستی سے کام لیا تو جس خدا نے اصحاب الفیل کا تہس نہس کیا تھا اسی کے عقاب میں وہ گرفتار ہوں گے۔

لیبیا میں شریعتِ اسلامیہ کی ہشت روزہ کانفرنس

از جناب حبیب ریحان صاحب ندوی، لیکچرار اسلامک انسٹیٹیوٹ بیضاء (لیبیا)

۲۲ ربیع الاول تا ۲۸ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ (۶ تا ۱۲ مئی ۱۹۷۲ء) لیبیا کے مشہور شہر البیضاء میں لیبیا یونیورسٹی کے لغت عربیہ و دراساتِ اسلامیہ کالج کی طرف سے ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں عالمِ عربی کے شریعت، اسلامیات، ملکی قانون، انشورنس کمپنیوں اور بینکوں کے نمائندوں وغیرہ نے شرکت کی۔ وقت کی کمی کی بنا پر اس کانفرنس کو عرب علماء تک محدود رکھا گیا۔

کانفرنس کے اس عظیم الشان اقدام پر دل کی گہرائیوں سے ہر مردِ مومن لیبیا کی حکومت کو مبارکباد پیش کرتا ہے، کیونکہ یہ دراصل اُس تاریخی قرارداد کی ایک کڑی تھی جس کی رو سے گذشتہ سال یہاں کی حکومت نے اسلامی شریعت کے مکمل قانون کو ملک میں نافذ کرنے کا منصوبہ پیش کیا تھا اور اس سلسلے میں تین ذیلی کمیٹیاں بنائی تھیں جو لیبیا کے موجودہ قوانین میں سے غیر اسلامی چیزیں جمع کریں اور پھر اسلامی شریعت کے مطابق انہیں ڈھالیں۔ یہ کمیٹیاں سپریم کورٹ کے فاضل چیف جسٹس اُستاد علی علی منصور کی زیرِ نگرانی تیزی سے اپنا کام کر رہی ہیں۔ یہ کانفرنس دراصل اسی لیے بلائی گئی تھی کہ قوانین اسلامیہ مرتب کرنے والی کمیٹیوں کو اس کی بحثوں اور قراردادوں سے اپنے کام میں مدد ملے۔ انشاءاللہ اگر یہ کام اسی انداز پر ہوتا رہا تو مستقبل قریب میں وہ دن دُور نہیں جب شریعتِ اسلامیہ کا قانون اپنے شمول و عموم کے ساتھ صرف عبادات اور پرسنل لاہی میں نہیں بلکہ تجارتی معاملات سے لیکر حدود و قصاص اور بین الاقوامی امور تک میں نافذ ہوگا، اور خدا کی سرزمین پر خدا کا مکمل و ابدی قانون جو لوگ بھی نافذ کریں گے فرشتگانِ رحمت ان پر نور اور رحمت کا سایہ کریں گے۔

حکومت نے اِن دو سالوں میں اسلامی نظامِ زندگی کو نافذ کرنے کے سلسلے میں کیا کیا احکام صادر کیے اور کس طرح ان کی تطبیق کی کوششیں کیں، مثال کے طور پر شراب کی ممانعت، زکوٰۃ کا اجراء، جہاد فنڈ کا افتتاح، جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کا قیام وغیرہ، یہ سب تفصیلی بحثیں ہیں۔ نیز ہفتہ بھر پر محیط اس کانفرنس میں کن کن

موضوعات پر بحثیں ہوئیں، ان سب کی تفصیل انشاء اللہ مستقبل قریب میں شائع ہونے والی ایک کتاب میں مبسوط طور پر نشر کی جائے گی، جس کا عنوان ہوگا "لیبیا میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی کوششوں کا مختصر جائزہ"۔ یہاں میں انتہائی اختصار کے ساتھ اس کی رُوداد پیش کرتا ہوں جس میں مکمل تصویر نہیں کھینچی جاسکتی۔

افتتاحی اجلاس | ۶ مئی کی صبح کو ۱۰ بجے حالیہ گورنمنٹ ہاؤس (سابق پارلیمنٹ) کے خوبصورت ہال میں کانفرنس کا افتتاح تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا۔ ہال علماء، فضلاء، اساتذہ، اور قانون دان حضرات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ عظیم الشان شخصیتوں میں اسلامی شریعت و قانون کے امامِ وقت اور مجتہد فضیلۃ الشیخ محمد ابوزہرہ، فضیلۃ الشیخ علی الخفیف، ازہر یونیورسٹی کے چانسلر فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر عبداللطیف، شام کے فقہی عالم استاد مصطفیٰ الزرقاء، اور ممتاز دوسری ہستیاں بھی تھیں جن کے نام ان کی ابحاث کے ساتھ آئیں گے۔ افتتاح کے بعد لیبیا کی انقلابی کمیٹی کے ممبر اور نمائندہ کیپٹن عمر عبداللہ المحیشی نے مختصر تقریر کی جس میں کانفرنس کے قیام پر علماء کرام کو مبارک باد پیش کی اور اسلامی شریعت کے مکمل نفاذ کا وعدہ کیا۔ پھر لیبی یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر عمر التومی الشیبانی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور حُسنِ توفیق کی دعا کی۔ بعدازاں مفتی لیبیا شیخ طاہر الزاوی نے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ ان کے بعد سپریم کورٹ کے فاضل جیف جسٹس علی علی منصور نے تفصیلی طور پر شریعتِ اسلامیہ کے فائدوں اور اس کے نفاذ کی کوششوں کی وضاحت کی اور علماء و اہلِ قانون سے اپیل کی کہ ان کی مؤقر آراء اس سلسلہ میں بہت مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ پھر لغت اور شریعت کالج کے ڈین شیخ ابراہیم رفیدہ نے شریعت کے محاسن بیان فرمائے اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں مہمانوں کی طرف سے مفتیٔ تونس شیخ محمد الہادی بلقاضی نے مختصر تقریر کی جس میں حکومت لیبیا، یونیورسٹی، شریعہ کالج، اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا، اور اس مومنانہ ارمان کا اظہار کیا کہ جس روز شریعتِ اسلامیہ مکمل طریقہ پر نافذ ہو جائے گی دنیا نور سے معمور ہو جائے گی۔

ا۔ شریعتِ اسلامیہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں تطبیق کی صلاحیت رکھتی ہے | اس موضوع پر ۶ مئی کی شام کو دوسرا اجلاس منعقد ہوا۔ یہ موضوع کیا ہے ایک مسلم الثبوت عقیدہ ہے جس میں کسی مسلمان کو شبہ کی گنجائش نہیں، لیکن سامراجی تعلیم و تربیت اور مسیحی مشنریوں کی جدوجہد، نیز مسلمانوں کی عام شریعت سے ناواقفیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ سورج سے زیادہ واضح اسلامی حقائق پر بھی تفصیلی ابحاث

پیش کرنی پڑتی ہیں تاکہ سامراجی پروپیگنڈا کا مکمل و مدلل جواب دیا جاسکے۔ اِن ابحاث کی تفصیل اس اختصار میں پیش کرنی مشکل ہے اس لیے صرف ان حضرات کے نام لکھنے پر اکتفاء کرتا ہوں جنہوں نے ان میں حصّہ لیا۔ شیخ ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن بیصار سکرٹیری جنرل مجمع البحوث الاسلامیہ، ازہر۔ استاذ مصطفیٰ احمد الزرقاء، پروفیسر اردن یونیورسٹی، استاذ شیخ احمد حمانی پروفیسر الجزائر یونیورسٹی وصدر مجلسِ اعلیٰ اسلامی، ڈاکٹر محمد عبدالجواد پروفیسر لاکالج لیبیا یونیورسٹی، ڈاکٹر محسن الشیکلی پروفیسر لاکالج لیبیا یونیورسٹی، ڈاکٹر مصطفیٰ احنین پروفیسر لغت و دراسات اسلامیہ کالج، استاذ یوسف القرضاوی مدیر معہد دینی قطر، استاذ محمد عجلان استاذ شریعہ کالج ریاض، ڈاکٹر عبدالرزاق حسن فرج لیکچرار لاکالج لیبیا یونیورسٹی۔

۲۔ اسلام میں عام انسانی حقوق اور آزادی | تیسرا اجلاس، ۲ مئی کی صبح منعقد ہوا۔ کانفرنس کا طریقہ یہ تھا کہ اہلِ علم اپنی بحث کا خلاصہ ۱۰۔۲۰ منٹ میں پڑھ کر سناتے تھے۔ پھر ان کی طویل بحثیں سائیکلو اسٹائل پر چھپی ہوئی سارے حاضرین مجلس کو دے دی جاتی تھیں۔ ان کو پڑھ کر دوسرے اجلاس میں ان پر تفصیلی بحث مباحثہ ہوتا تھا جو مجادلانہ و مناظرانہ انداز کے بجائے مزید تنقیح و تحقیق کا باعث ہوتا تھا۔ آج کے اجلاس میں کل کی ابحاث پر مختصر مباحثہ ہوا جس کی تفصیلی کتاب میں درج کی جائے گی۔ اس کے بعد کانفرنس کا دوسرا موضوع "اسلام میں عام انسانی حقوق اور آزادی" شروع ہوا۔ یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ انسان کو جان و مال اور آبرو سے متعلق جتنے حقوق اسلام نے عطا کیے ہیں نہ صرف یہ کہ قدیم عصرِ حجری اور زمانہ جاہلیت کی رسوم نے عطا نہیں کیے بلکہ اہلِ کتاب کی قانونی تشریحات اور رومن قانونی ترقی نے بھی اور حتیٰ کہ آج تک امریکن منشور آزادی، فرانسیسی منشور حریت اور اقوامِ متحدہ کے منشور حقوقِ انسانی نے بھی نہیں بخشے۔ اور جو کچھ بخشے بھی وہ پہلی بات تو یہ کہ اسلام کے سینکڑوں سال کے بعد، اور دوسری تلخ بات یہ کہ وہ صرف کاغذ پر خوشنما پھول کی طرح سجے ہوتے ہیں۔ مظلوم قوموں اور محروم افراد نے ان سے کوئی انصاف نہیں پایا، بلکہ ان کے لیے وہ خار بن کر خلش کا باعث ہیں۔ اور تیسری بات یہ کہ آزادی کے نام پر الحاد، بے حیائی، آوارگی، قومی لسانی جنسی اور لونی تعصب پھیلایا گیا۔

بہر حال اس موضوع پر علمی و تقابلی انداز میں بہت اچھی بحثیں پڑھی گئیں اور یہ بتایا گیا کہ اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پہلے دن سے آزادی کے حدود متعین کیے ہیں تاکہ ایک شخص کی آزادی سے کسی دوسرے شخص یا قوم کا نقصان نہ ہوگا۔ اسی طرح خدا اور اس کے احکام سے بغاوت کی آزادی نہیں

اس کے بعد نفس کی شرارتوں، حکام کے ظلم و ستم، اور شیطان کے فریبوں سے آزادی کی مکمل دعوت اسلام کے حیات بخش پیغام میں سموئی ہوئی ہے۔ اور اسلام نے مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو بھی وہ آزادانہ حقوق اور حریات عطا کی ہیں جن کی نظیر تاریخ قدیم و جدید میں نہیں ملتی۔ اس اہم موضوع پر حسب ذیل حضرات نے ابحاث پیش کیں: ڈاکٹر شیخ بدوی عبد اللطیف چانسلر ازہر یونیورسٹی، ڈاکٹر قطب محمد القطب اسسٹنٹ پروفیسر لغت و شریعت کالج، ڈاکٹر محسن الششکلی، ڈاکٹر صبحی صالح پروفیسر اُردن یونیورسٹی۔

۳۔ شریعتِ اسلامیہ کے بنیادی قواعد و اصول: یہ کانفرنس کا تیسرا موضوع تھا جو تیسرے اجلاس میں پیش ہُوا۔ اس میں کتاب و سنت و اجماع اور پھر قیاس و اجتہاد وغیرہ سے متعلق بحث کی گئی اور یہ ثابت کیا گیا کہ فقہ اسلامی کی عظیم میراث اپنے اندر ایسی قانونی صلاحیت رکھتی ہے کہ ہر زمانہ میں پیدا ہونے والے مسائل کا حل اس کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ اور قیاس و اجتہاد کی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ اصولِ شریعت کے خلاف نہ ہوں اور کسی بنیادی اصول سے نہ ٹکراتے ہوں اور اسلامی روح یعنی کتاب و سنت سے معارض نہ ہوں کہ یہی حق جانچنے کا معیار و میزان ہے۔ اور کسی ایسی چیز میں قیاس و اجتہاد کی اجازت ہی نہیں جس میں نص یعنی کتاب و سنت کی دلیل یا اجماع موجود ہو۔ اس موضوع پر بحث کرنے والوں کے نام یہ ہیں: ڈاکٹر عبد الجلیل قرنشاوی پروفیسر لا کالج لیبیا یونیورسٹی، ڈاکٹر عباس حمادہ اسسٹنٹ پروفیسر لغتہ و دراستہ اسلامیہ کالج، ڈاکٹر حسین حامد حسان اسسٹنٹ پروفیسر لا کالج قاہرہ یونیورسٹی۔

۴۔ شریعتِ اسلامیہ میں مصلحت و عُرف کا مقام: شام کے چوتھے اجلاس میں اس موضوع پر بحث کی گئی جو گذشتہ موضوع سے متصل تھا، لیکن خصوصی اہمیت کی وجہ سے اس کو علیحدہ رکھا گیا تھا۔ اور واقعی یہ موضوع انتہائی اہم ہے، کیونکہ اسلام کو قیامت تک زندگی کا ساتھ دینا تھا اور تمام اقوامِ عالم اس کے زیرِ اثر ہونے والی تھیں، اس لیے مصلحت و عرف کو بڑی اہمیت دی گئی، اور اس طرح تمام وہ رائج الوقت چیزیں جن میں کتاب و سُنّت یا اجماع نہیں ہے، یعنی وہ شرعی طور پر ممنوع نہیں ہیں، یا ان کے کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، ان میں امت کی عام مصلحت، فائدہ اور عرفِ صحیح پر عمل کیا جائے گا۔ ایک زندہ و پائندہ شریعت کے لیے یہ ضروری چیز ہے۔ لیکن اس مصلحت، عُرف اور آگے چل کر اجتہاد کے نام پر اسلامیات کے نام نہاد یورپین اور مسیحی اسکالر (مستشرقین)، اور ان کے مشرقی اسلام کے نام لیوا شاگردوں نے یہ بات عام کرنے کی پوری کوشش شروع کر دی ہے کہ اسلام مصلحت کے تقاضوں کو پورا کرنے کا

حکم دیتا ہے، اس لیے اب عرب کا بدویانہ عرف ساری دنیا کے لیے کیونکر موزوں ہو سکتا ہے؟ اور دوسری بات یہ کہ سینکڑوں برس بعد اب وہ کیسے قابلِ عمل رہ سکتا ہے؟ اس لیے اب عصرِ حاضر کے سارے ترقی یافتہ پیمانے ہی قابلِ قبول ہونے چاہییں۔ مثال کے طور پر اُس زمانہ میں سُود کا رواج غلط سمجھا جاتا تھا، اب جدید تمدن کا عُرف یہ ہے کہ سُود بہت بڑی تجارتی فائدہ کی چیز ہے۔ اس لیے اب اس کو بدل دینا چاہیے یا فلاں آوارگی، حرام کاری، حرام خوری عام ہو چکی ہے، یا فلاں شرعی قانون، یا فلاں چیز اب زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس لیے اس میں ترمیم و تبدیلی کر لینی چاہیے۔ بہر حال اس قسم کی لاطائل باتوں اور حقیقتاً اصولِ شریعت و عقل کی ابتدا سے بھی جہالت و ناواقفیت آشکارا کرنے والی، شریعت کی مخالف اور اسلام بیزار لیکن بظاہر علمی و استدلالی انداز، شریعت کی محبت اور اسلام دوستی کا دم بھرنے والی ابحاث کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی ناکام کوشش کی جارہی ہے کہ غیر شرعی قوانین شرعی ہیں، اور غیر اسلامی اقدار خالص اسلامی چیزیں ہیں، اور انسانی اوامر خدا کے احکام ہیں۔

حالانکہ اس سلسلے میں سب سے پہلی، اصولی اور آخری بات جسے فقہ کا ہر طالب علم جانتا ہے، اور یہ حضرات بھی اچھی طرح جانتے ہیں، لیکن سادہ لوح علمِ دین اور اصولِ فقہ سے ناواقف مسلمانوں میں غلط فہمی پھیلانے کے منظم منصوبے اور سازش کے ماتحت اس ابتدائی اور اصولی مسلم الثبوت اور بدیہی اور دین میں معلوم بالضرورۃ قاعدہ سے نظر پوشی و اغماض کرتے ہیں ـــــ وہ اصول یہ ہے کہ مصلحت اور عرف پر اُسی صورت میں عمل کیا جائے گا یا اجتہاد کی نوبت اُسی وقت آئے گی جب اس معاملہ میں کتاب و سنت کا کوئی قطعی حکم موجود نہ ہو، پھر وہاں بھی اجتہاد اُن مسائل پر قیاس کے ساتھ ہوگا جن میں نص موجود ہو، اور وہ رُوحِ شریعت اور شرعی اصولوں اور تقاضوں کے ماتحت ہوگا۔ عرف و مصلحت کا حال بھی یہی ہے کہ عبادات و احکام میں ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ زندگی کے عام معاملات اور اجتماعی چیزوں میں جہاں مسلمانوں کو شارع نے آزاد چھوڑا ہے اور کسی قسم کا حکم یا ممانعت نہیں کی ہے وہاں وہ ایسے صالح عرف یا مصلحت پر عمل کر سکتا ہے جو اسلام کے کلی اصولوں، شریعت کے تقاضوں اور دین کی رُوح کے منافی نہ ہوں، جیسے کھانے پینے کے حلال طریقے، لباس وغیرہ کی متنوع شکلیں جو ساتر ہوں اور خصوصیت کے ساتھ غیر مسلم قوموں کا مذہبی شعار نہ ہوں، اسلحہ کے نت نئے استعمال، زراعت و صناعت کے جدید وسائل، اور دنیاوی استعمال کی بے شمار چیزیں۔ لیکن یہ بات شرعاً ہی نہیں بلکہ عقلاً

بھی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ مصلحت، عرف یا اجتہاد کے نام پر کوئی مسلمان سود، زنا، سؤر، شراب، والدین کی نافرمانی، قتلِ نفس، چوری اور متفرق دوسری محرمات کو امریکہ و یورپ کے عرفِ عام پر قیاس کر کے حلال کرنے کی کوشش کرے۔ یا بالکل اسی طرح عرفِ اسلامی میں اور نصِ قرآنی و نبوی میں منصوص طیبات جیسے شادی، طلاق، میراث، اکلِ حلال، نظامِ زکوٰۃ، توحید باری تعالیٰ، وغیرہ جیسی اسلام کی قابلِ فخر خوبیوں کو اپنی یورپ سے مرعوب و مسحور عقل سے کیے ہوتے اجتہاد، اور غیر قوموں کے اعمال پر قیاس کر کے حرام ثابت کرنے کی راہیں تلاش کرے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص دن کی روشنی میں چراغ کی لو سے اپنی راہ تلاش کرنے کی سعی لاحاصل میں گرفتار ہو۔

بہر حال اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی، تعریفیں بتائی گئیں، اقسام بیان کی گئیں اور یہ واضح کر دیا گیا کہ کتاب و سنت یا شریعت کی رُوح کے معارض کسی مصلحت یا عرف کو بھی اسلامی معاشرہ میں زندہ رہنے کا حق نہیں ہے لیکن صحیح عرف اور مصلحت کا صحیح استعمال اسلامی طرز پر جب کیا گیا تو مسلمانوں نے اقوام عالم کی خوبیوں اور علوم کو اپنانے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ البتہ مصلحت یا عرف کے نام پر اقوامِ عالم کی گندگیاں، آزادیاں، بدشقتیں، شہوت رانیاں، غیر شرعی چیزیں اور حرام طریقہائے زندگی ہرگز نہیں اپنائے جا سکتے۔ اس موضوع پر حسبِ ذیل حضرات نے گفتگو کی، ڈاکٹر زکی شعبان پروفیسر لا کالج لیبیا یونیورسٹی، شیخ عبدالمجید الدیبانی اسسٹنٹ پروفیسر لغہ و دراسۃ اسلامیہ کالج، مفتی تونس شیخ محمد الہادی بلقاضی، ڈاکٹر عبدالجواد محمد اور ڈاکٹر حسین حامد حسان۔

۵۔ لیبیا کے حالیہ قوانین میں اسلامی اقدار | ۸ مئی کی صبح پانچواں اجلاس ہوا۔ سابقہ نشست کے موضوع پر تفصیلی مباحثہ ہوا جس کو نظر انداز کرتے ہوتے آگے بڑھتا ہوں۔ اس مباحثہ کی وجہ سے آج کے دو موضوعات میں سے صرف ایک ہی پر بحث کی جا سکی۔ ڈاکٹر عبدالعزیز عامر لغۃ و دراسۃ اسلامیہ کالج کے پروفیسر مصری سپریم کورٹ کے فاضل جج اور ترمیم قوانین کی ایک کمیٹی کے ممبر نے تفصیل سے اس موضوع پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ وہ قوانین جو شریعت کی مخالفت نہیں کرتے کافی ہیں لیکن بعض ایسے اہم نکات کی طرف اشارہ کیا گیا جو لیبیا اور اکثر اسلامی ملکوں کے قوانین میں موجود ہیں اور جو شریعت کی روح، خدا کے حکم اور اسلام کے سراسر مخالف ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سارے قوانین فرانسیسی، انگریزی اور جرمن قوانین سے ماخوذ ہیں اور سامراجی دور میں مسلم ملکوں پر لاد دیئے گئے تھے۔ مثال کے طور پر سود، کھیل کود میں جوا، لاٹری،

موجودہ اصولوں کے ساتھ انشورنس، زنا کا قانوناً غیر شادی شدہ کے لیے کوئی جرم نہ ہونا، باہمی رضامندی کے ساتھ بھی اس کا کوئی جرم نہ ہونا اور صرف زنا بالجبر کا جرم ہونا۔ اس پر بھی شرعی سزا نہیں ہے بلکہ شادی شدہ ہونے کی حالت میں اگر میاں یا بیوی معاف کر دیں تو مقدمہ واپس ہو سکتا ہے۔ یہ سب مغربی انحطاط اخلاقی سے متاثر قوانین کی عکاسی ہے۔ اسی طرح قتلِ عمد کی صورت میں قصاص نہیں ہے۔

بہرحال یہ بحث تفصیلی تھی۔ یہاں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہوں، شاید فائدہ سے خالی نہ ہو۔ وہ یہ کہ اسلام نے مغربی قوانین کے مخالف کیسا عاقلانہ فیصلہ کیا ہے کہ قتل کی صورت میں معافی کا حق حکومت کو نہیں دیا بلکہ ولی الدم کو دیا، اس لیے کہ یا تو اس طرح دل کا غبار اور غصہ عادلانہ قصاص کے ذریعہ ختم ہو جائے گا یا دیت کی شکل میں اور معافی کی صورت میں ــ کہ اسلام نے اس پر ابھارا بھی ہے ــ محبت واخوت کی فضا پھر قائم ہو جائے گی۔ لیکن اس کے برخلاف اخلاقی جرم جیسے زنا کی معافی کا حق ثبوت قطعی، اور شروط کے پورے ہو جانے کی صورت میں ـــــ اور یہ شروط اور شہادت کے اصول اتنے سخت ہیں کہ ان کا پورا ہونا بہت مشکل ہے ـــــ نہ حکومت کو دیا گیا اور نہ شوہر اور بیوی میں سے کسی کو، کیونکہ یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں اور ان میں معافی تلافی کی صورت میں بداخلاقی عام ہو گی، زوجیت کے مقدس اور مخلصانہ رشتۂ وفا کے آئینہ صافی پر بال پڑ جائے گا، آبرو باختگی اور حیا سوزی کا دور دورہ ہو جائیگا۔ سوسائٹی میں سکون واطمینان کے بجائے قلق، پریشانی، ندامت اور ذہنی خلجان بڑھ جائے گا اور شکوک و شبہات کا یہ طریقِ عمل آگے چل کر نفرت وحقارت کے علاوہ انتقام وغیرت کی خاطر قتل وخون کا غیر قانونی دروازہ بھی کھول دیگا۔ بہرحال اخلاق، آبرو، عصمت اور حیا کا درجہ مغربی تہذیب اور قانون میں نہ صرف یہ کہ جانی حقوق سے کم ہے بلکہ طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ مال سے بھی کم ہے۔ کیونکہ بعض ملکوں میں لڑکی اپنے مالی وتجارتی حقوق ـــــ جو اس نے بڑی جدوجہد کے بعد کچھ حاصل کیے ہیں ـــــ ان کا استعمال آزادی کے ساتھ ۲۱ سال کے بعد کر سکتی ہے۔ لیکن جنسی حقوق کا ناجائز استعمال پوری آزادی، بے حیائی اور بے شرمی کے ساتھ ۱۸ سال ہی سے قانوناً شروع کر سکتی ہے، اور قانونی عمر سے بہت پہلے سوسائٹی میں عام جنسی آوارگی اور آبرو باختگی کا اندازہ تو ہم مشرقی اور مسلمان ذہن لگا ہی نہیں سکتے۔ اور یہی وہ اخلاقی "خوبیاں" اور تمدن کے "تحفے" ہیں جنہیں ترقی کے نام پر مسلمانوں کے مغربی اور مسیحی دانا دشمنوں کی سازشوں اور لئیمانہ کوششوں سے فریب خوردہ مشرقی مسلمان نادان دوست اسلامی معاشرہ میں طرح طرح کے نام

بدل کر پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں ؎

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا نبی عفت و غم خواری و کم آزاری

صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے مے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

۱۔ اسلام میں بین الاقوامی تعلقات، اسلامی ملکوں اور غیر اسلامی ملکوں کے ساتھ

۹ مئی کی صبح کانفرنس کا چھٹا اجلاس شروع ہوا۔ پچھلی مجلس کے موضوع پر مباحثے کے بعد آج کا موضوع شروع ہوا۔ اس موضوع میں یہ بات اہم ہے کہ اسلام نے اس سلسلے میں بھی ایسے کلّی اصول عطا کیے ہیں جن کی روشنی میں بین الاقوامی تعلقات قائم کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ آج یورپ و امریکہ میں بھی اِس موضوع پر امام ابوحنیفہ کے شاگرد امام محمد بن الحسن الشیبانی کو امامت کا درجہ عطا کیا جا رہا ہے، اور ان کے نام سے بین الاقوامی سوسائٹیاں بن رہی ہیں۔

اس موضوع میں تفصیلی طور پر دار الاسلام، دار الحرب، دار المعاہدہ اور دار الموادعہ وغیرہ کی اسلامی اصطلاحوں پر بات ہوئی۔ اس بات کی تردید کی گئی کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے بلکہ ثابت کیا گیا کہ اسلام اپنے فطرتِ بشریہ کے موافق قوانین اور منصفانہ اصولوں، انسانی کرامت کے احترام اور بے شمار خوبیوں کی وجہ سے پھیلا ہے۔ تلوار کا استعمال شریعت کی حفاظت، جان و مال کی حفاظت اور اسلامی زمین اور آبرو کی حفاظت کے لیے کیا گیا، اور ہمیشہ تلوار توپ اور بم کا استعمال ضروری ہے، یعنی جہاد فرض ہے، کیونکہ ایسی ابلیسی سرشت طاقتیں ہمیشہ دنیا میں موجود رہتی ہیں جو طاقت کی منطق کے سوا کسی دوسری چیز سے ہوش میں نہیں آتیں، اور اسلامی ممالک میں سامراجی طاقتوں کا داخل ہونا اور مدتِ دراز تک قابض رہنا اس کی بڑی دلیل ہے کہ جب قوت کمزور ہوتی ہے تو اسلام دشمن عناصر غلبۂ باطل کے منصوبے بناتے ہیں ___ اور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آج دنیا کی ساری حکومتیں جنگی تیاریوں اور اسلحہ پر بے دریغ پیسہ خرچ کرتی ہیں اور وزارتِ جنگ کا نام ڈیفنس یا دفاع کی وزارت رکھتی ہیں اور ان کی اس وزارت پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ بلکہ راقم ایک نیا استنتاج پیش کرتا ہے وہ یہ کہ آج ترقی یافتہ قومیں جبری فوجی ٹریننگ تمام بالغین کے لیے مقرر کرتی ہیں اور اس سے انکار کرنے والوں کو سزا بھی دی جاتی ہے۔ لیکن اگر اسلام جہاد کو فرض قرار دیتا ہے، اور یہ ایسا جامع لفظ ہے جو جنگ اور ڈیفنس دونوں سے زیادہ اہم معنی اپنے اندر رکھتا ہے، اور تقویٰ و اخلاق و مجاہدہ کا مظہر بھی ہے، اور یورپ سے

تیرہ سو سال قبل ہر مسلمان پر اس نے فوجی ٹریننگ لازمی قرار دی ہے تاکہ وہ اپنے عقیدہ، آبرو اور حدود کی حفاظت اسلام دشمن طاقتوں کے مقابلے میں کر سکیں تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ یہ تماشا، جہالت و تعصب، تنگ نظری اور واضح طور پر اسلام سے حسد و بغض و نفرت کا مظہر نہیں تو اور کیا ہے؟ وہی عمل جسے دنیا کی ساری قومیں ہمیشہ کرتی ہیں، اسلام بھی اگر اسے زیادہ منظم اخلاقی اور محتاط طریقے پر کرے تو اسلام دشمنوں کے باشعور ضمیر فوراً چونک پڑتے ہیں، اور یہی باشعور اور بیدار ضمیر ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی نعوذ باللہ خدا کی طرف سے ایسے سخت احکام صادر کرائے ہیں جن کی رو سے جنگ میں شریک ہونے والے اور نہ ہونے والے، غیر مسلح شہری بلکہ پُر امن اور دشمنی ظاہر نہ کرنے والی دوسری قومیں تک سب کی سب تلوار سے قتل کی جاتی ہیں اور نہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں سمیت شہر تک جلا دیئے جاتے ہیں اگر ان میں عبادتِ باطلہ جاری ہو جائے (استثناء ۱۳: ۱۲-۱۸ و ۲۰: ۱۰-۱۸)۔ اور اس سے بھی زیادہ سختی، شدت بلکہ ظلم کا رویہ اکثر یہودی اور مسیحی تاریخ کے ہر دور میں ملتا ہے۔ صرف مثال کے طور پر مستشرقین کے زندہ ضمیر گروہ کو خلیفہ موسیٰ یشوع کی طرف منسوب کردار جو یریحو (اریحا) شہر کی فتح کے وقت پیش کیا گیا تھا، سنانا چاہتا ہوں: "اور انہوں نے ان سب کو جو شہر میں تھے کیا مرد کیا عورت کیا جوان کیا بڈھے، کیا بیل کیا گدھے کیا بھیڑ سب کو تلوار کی دھار سے بالکل نیست کر دیا۔ پھر انہوں نے اس شہر کو اور جو کچھ اس میں تھا سب کو آگ سے پھونک دیا اور فقط چاندی اور سونے کو اور پیتل اور لوہے کے برتنوں کو خداوند کے گھرانے کے خزانہ میں داخل کیا" (یشوع ۶: ۲۱-۲۴)۔ نیز ان کارناموں کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی تفصیل مزید: ۸: ۲۸ اور ۱۰: ۱۱ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ تاریخی تفصیل کا یہ موقع نہیں ورنہ یہ دردناک داستان اتنی طویل ہے کہ پوری ایک کتاب اس کے لیے ناکافی ہے۔ بہر حال یہ زندہ ضمیر لوگ شارلمان کی اسی نسل سے ہیں جس نے سیکسونی، بوہیمی اور متعدد یورپین وحشی قوموں کو تلوار کے زور سے مسیحیت میں داخل کیا تھا۔ یہی وہ باشعور ضمیر ہیں جنہوں نے دو سو برس تک تلوار و تفنگ کے ذریعہ بلا کسی قانونی حق کے برصغیر ہند پر حکومت کی تھی، مشرق وسطیٰ میں پھانسیوں کے تختے لٹکائے تھے، اور ہیروشیما کو جہنم زار بنایا تھا، اور تاریخ کی سب سے زیادہ تباہ کن دو جنگیں لڑی تھیں اور جن کے کارخانوں میں آج بھی دنیا کے سب سے مہلک ہتھیار بے شمار بن رہے ہیں، اور ان سب کوششوں کا نام قیامِ امن ہی کی کوششیں رکھا جا رہا ہے، لیکن ہلاکت و بربادی، خونخواری و ستم کیشی اور ظلم و ستم صرف اسلام کا فریضۂ جہاد ہی ہے؟ بہر حال حق پسند

اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلامی جہاد تاریخ کا سب سے پہلا منظم جنگی اور اخلاقی قانون ہے اور آج بیسویں صدی میں ماڈرن قومیں ایک طرف فوجی تربیت ہر شخص پر لازمی قرار دے رہی ہیں اور دوسری طرف جنگ کو کسی قدر اخلاقی بنانے کے لیے جنیوا رولز وغیرہ بنا رہی ہیں جو آج تک اس کے عشر عشیر کو نہیں پہنچ سکے جو اسلام نے تیرہ سو سال قبل اپنائے تھے۔

موضوع اہم تھا اور دماغ کے بند دروازے کھل گئے اس لیے کچھ تفصیل میں چلا گیا تھا۔ اب پھر کانفرنس کی طرف رُخ کرتا ہوں ـــــ یہ بات بتائی گئی کہ در اصل امتِ اسلامیہ ایک امت ہے، لیکن حالات کے پیشِ نظر متعدد اسلامی ملک ہیں۔ اگر قیادت امین ہاتھوں میں ہو تو اس تعدّد کے باوجود بھی متحد قانون بنایا جاسکتا ہے اور اسلامی ملکوں سے تعلقات و روابط اسلامی بنیادوں پر مخلصانہ، دوستانہ اور برادرانہ ہونے چاہییں دوسری دشمن حکومتیں ہیں جو اسلام کی مخالف ہیں اور عملی طور پر مسلمانوں کے خلاف اقدام کرتی ہیں۔ تیسری وہ غیر مسلم حکومتیں ہیں جن سے ہمارے معاہدے ہیں، وہ ہمارا احترام کرتی ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ظلم و ستم اور تعصب سے پیش نہیں آتیں، اور دوستی کا احترام کرتی ہیں۔ ہم بھی ان سے عہد و پیمان کا احترام کرتے ہیں اور ان سے بلا وجہ دشمنی نہیں کرتے کہ اسلام انسانی احترام کا قائل ہے اور عہد شکنی کی مذمت کرتا ہے تفصیلی طور پر اسلامی حکومتوں کے زمانہ میں غیر مسلم حکومتوں سے تعلقات، معاہدات اور ہدایا وغیرہ کی بھی تفصیلی بحث کی گئی۔ اقوام متحدہ کے اصولوں پر بھی گفتگو ہوئی۔ اس موضوع پر تین حضرات نے بحث کی ڈاکٹر مصطفیٰ حسنین، ڈاکٹر محسن الشنقلی اور ڈاکٹر محمد عبد الحلیم لیکچرار لغۃ و شریعۃ کالج و ممبر اسلامی قانونی کمیٹی برائے تعدیل قوانین حالیہ۔ آپ کی تعلیم زیادہ دینی نہیں ہے بلکہ سربون یونیورسٹی فرانس سے بین الاقوامی قوانین پر تین پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں لیکن قلب و نظر اسلام کی حقیقت سے باخبر ہیں اس لیے دل کے بادشاہ ہیں اور دیارِ غیر میں رہنے، اور پڑھنے کے باوجود اپنے سرمایہ حیات پر نازاں اور فقہ اسلامی کی قدر و عظمت پر فریفتہ ہیں۔

۷۔ اسلامی شریعت میں حدود و اور نئے قوانین میں انکی تطبیق | بین الاقوامی تعلقات کے بعد آج کا اصلی موضوع شروع ہوا۔ یہ حقیقتِ حال تمام اہلِ فکر و نظر کے سامنے واضح ہے کہ آج کے عصر حاضر میں جہاں مغربی سوسائٹیوں کا معیار اخلاقی انحطاط و زوال کی آخری ڈگری پر پہنچ چکا ہے اور قتل و غارتگری، چوری، ڈاکہ، رہزنی، حرام کاری اور حرام خوری وغیرہ جیسے عیوب عام ہو چکے ہیں اور ان کے روکنے کی ساری

تدبیریں بے سُود ہوتی جا رہی ہیں، بلکہ جرائم میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، تمام قانون بنانے والے ادارے حیران و پریشان ہیں۔ جیلوں، عدالتوں، ججوں اور وکیلوں کی ہر جگہ بہتات ہے۔ پھر بھی انصاف و عدالت کے خواہاں مضطرب اور بے چین ہیں — اس پریشان اور مضطرب ماحول میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس اخلاقی انحطاط کے خلاف کوئی مؤثر اقدام کیا جاتا، لیکن اس کے برخلاف مجرموں کے ساتھ نت نئے ناموں اور بہانوں سے رحم و کرم کا جذبہ اُبھر رہا ہے اور اس کے زیرِ سایہ اسلامی حدود پر وحشیانہ، بدویانہ، ظالمانہ اور عصرِ حاضر کے ذوق کے خلاف ہونے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ تاریخ و تجربہ کی مسلم الثبوت شہادت ہے کہ سوسائٹی کو سکون سے آشنا بنانے کے لیے جتنے بھی قوانین آج تک پردۂ ہستی پر بنائے گئے ان میں اسلام کا نظامِ تربیت و اخلاق اور اس کے بعد نظامِ حدود سب سے زیادہ مؤثر اور کارگر ہوا ہے۔ کیونکہ اسلام پہلے تو اپنی تعلیمات کے ذریعہ خدا پرستی، معرفتِ نفس، اخوت، ہمدردی اور طہارت و عفت کے عالی جذبات پیدا کرتا ہے، لیکن اگر چند بے راہرو شیطان نفس کی اتباع کرنا چاہتے ہیں اور سوسائٹی میں فواحش پھیلانا چاہتے ہیں تو اسلام ان کو سخت سزا دے کر سوسائٹی کو پاک و صاف بنانا چاہتا ہے۔ اور اسلامی حدود ایسی نہیں ہیں کہ اگر نافذ ہو جائیں تو عوام پریشان ہو جائیں، بلکہ اس کے برعکس سب سکون و چین کی نیند سو جائیں۔ چوری، ڈاکہ، قتل، بے آبروی اور حرام کاری کا ہر داغ مٹ جاتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو لوگ ان اعمال کے گرویدہ اور دلدادہ ہیں انہیں اس سے بہت نقصان ہوگا اور وہ اس کے قیام کے خلاف ہمیشہ اپنی جد و جہد جاری رکھیں گے۔ پھر حدود کو نافذ کرنے میں جس احتیاط، گواہی کے شروط اور سخت اصولوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹے شک یا شبہ سے حدود ختم ہو جاتی ہیں، اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اسلام نے ایک طرف انصاف و عدالت کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور دوسری طرف علاج، دوا اور پرہیز کے بعد حدود کو قائم کیا ہے۔ ہر شخص کو پیٹ بھر کر روزی اور بنیادی ضروریات مہیا کرنا اسلامی حکومت کا فرض ہے۔ پھر اس کے بعد حرص و ہوس اور معیارِ زندگی کے چکر میں پڑ کر اگر کوئی چوری کرے گا تو یقیناً اسے سزا دی جائے گی، اسلام نے شادی کے معاملہ میں آسانیاں مہیا کیں، پھر نا چاقی کی صورت میں طلاق میں رکاوٹیں نہیں ڈالی گئیں، ایمان و اخلاق و تقویٰ کا درس دیا گیا۔ اس کے بعد بھی حرامکاری کرنے والے کو سزا دی جائے گی۔ لیکن گواہی کی ایسی سخت شرطیں رکھی گئی ہیں کہ تاریخ اسلام میں آج تک زنا کے سلسلہ میں کوئی سزا گواہی کے ذریعہ نہیں ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس

فعلِ قبیح کی مذمت ظاہر کرنے کے لیے اور سوسائٹی میں فواحش پھیلنے کو روکنے کی خاطر قانون میں یہ لم رکھی گئی ہے جس کا مشاہدہ یورپ و امریکہ کے پارکوں، کلبوں، سڑکوں اور رفاہِ عام کی جگہوں پر ہوتا رہتا ہے۔ چوری چھپے سہمتے ڈرتے گھر کی چار دیواری میں گناہ سمجھتے ہوئے بدفعلی کا صدور ہر اُس جگہ جہاں انسان رہتے ہیں ممکن ہے لیکن علانیہ، قانون کے ذریعہ، لوگوں کی نظروں کے سامنے ثواب سمجھ کر ہر قسم کی فطری و غیر فطری بدکرداریوں کو جواز کا فتویٰ تو غلاظت و نجاست کے عروج کے زمانہ میں رومن امپائر کے منچلے تک نہ دے سکے تھے جیسے آج قانونی سند مغربی تہذیب کے دیوانوں نے دے رکھی ہے۔

اس سلسلہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ مثال کے طور پر چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ چوری کی وجہ سے اکثر اوقات گھرانوں کا سکون مٹ جاتا ہے، برسوں کی پونجی لُٹ جاتی ہے اور نوبت چور کی طرف سے قتل تک کی آجاتی ہے اور سوسائٹی میں کسی طرح چوری ختم نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف جب اسلامی حدود نافذ تھیں شاذ و نادر ہی چوری ہوتی تھی اور آج بھی دنیا میں سب سے کم چوری کی شرح سعودی عرب میں ہے۔ حیرت نہیں تو اور کیا ہے کہ وحشی، لٹیری اور چوری کی عادی قوم ــــ آج سے پچاس سال قبل کے احوال جاننے والے اس حقیقت سے باخبر ہیں ــــ کس طرح ایماندار اور چوری سے باز رہنے والی قوم بن گئی۔ کوئی صاحب اس کی یہ توجیہہ و تاویل نہ کریں کہ مال و زر کے انبار انہیں مل گئے۔ کیونکہ امریکہ یقیناً سعودی عرب سے زیادہ مالدار، زیادہ تعلیم یافتہ، اور عصرِ حاضر کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ وہاں چوری اور دوسرے سنگین جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہے اور اس کے حساب کے لیے اب منٹ تک ناکافی ہو کر نوبت سکنڈوں تک آگئی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ابن سعود کی پوری مدت حکومت ۲۴ سال میں صرف ۱۶ چوری کی وارداتیں ہوئی تھیں، جبکہ ابن مسعود کا شروع زمانہ فقر و مصائب اور مشاکل کا زمانہ تھا۔ یہ بجائے خود اس اعتراض کا بھی جواب ہے کہ اگر اسلامی قانون نافذ کر دیا جائے تو سوسائٹی میں ہر طرف ٹنڈے ہی ٹنڈے نظر آئیں گے۔ یہ اعتراض بالکل قابلِ اعتبار نہیں کیونکہ اس طرح تو پھر ہر اچھی چیز چھوڑنی پڑے گی۔ موٹروں کو ایکسیڈنٹ کے خطرے اور سوسائٹی میں اپاہج پیدا کرنے کے الزام میں چھوڑنا پڑے گا۔ ہوائی جہاز، فیکٹریاں، تعمیر و ترقی کے سارے پلان بند کرنے پڑیں گے کیونکہ عام فائدہ کی ہر چیز میں کسی نہ کسی فرد کے لیے نقصان نکل ہی سکتا ہے۔

اس سلسلے کی آخری بات رہ گئی۔ میں یہاں قدیم و جدید قوموں کے قوانین پر ناقدانہ گفتگو کرنا نہیں

چاہتا بلکہ صرف عصرِ حاضر کے ترقی پسند، آزاد، مہذب ذہن اور زندہ ضمیر سے جو حدود کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کرے کہ قاتل کو قتل کیا جائے، چور کا ہاتھ کاٹا جائے اور اسلامی قصاص وحدود کو وہ قبول کرے جس طرح عالمی ضمیر نے ویٹ نام میں انسانی ہلاکت کا سامان بہم پہنچایا، اور سرخ انقلاب میں ۵۰ لاکھ انسانوں کو آزادی اور مساوات کے نام پر خاک و خون میں تڑپایا۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کی اجازت دی، چور کی سزا قتل تک تجویز کی، سامراجی زمانہ میں پھانسی کے تختے لٹکائے، پھر انسانی چربی سے صابون بنائے گئے، انسانی کھال جوتوں میں استعمال کی گئی، آتشیں بموں نے جسموں کو خاکستر بنایا، پستول کی گولیاں چوروں اور ڈاکوؤں کے ذریعہ ہر پُرامن شہری کے سینہ کو داغدار کرنے کا ارمان رکھتی ہیں، اور آبرو باختگی اور جنسی انارکی کے مریض ہر عفت مآب گھرانے کا سکونِ دل لوٹنے کے لیے بیقرار نظر آتے ہیں۔ ایسے پاکباز، طاہر و لطیف اور بیدار مشرقی و مغربی عالمی ضمیر پر ذرا سی کوشش بھی اگر کی جائے تو شاید مجرم کو سزا دینے پر وہ راضی ہو ہی جائے اور اسلام کی منظم حدود اسے اپنے غیر قانونی کردار اور جنگل کے دستور کے مقابلہ میں زیادہ منصفانہ اور ہلکی نظر آئیں۔

اس موضوع پر تفصیلی بحثیں استاذ فتحی بہنسی مصر کے مشہور وکیل، اور ڈاکٹر منصور محمد الشیخ اسسٹنٹ پروفیسر لغۃ و شریعۃ کالج نے پیش کیں جن کی تفصیل کتاب ہی میں پیش کی جاسکے گی۔ حدود کے دائرہ میں حسبِ ذیل چیزیں آتی ہیں: ۱۔ ارتداد، ۲۔ حرابہ، ڈاکہ وغیرہ، ۳۔ زنا، ۴۔ قذف (اصطلاحی معنوں میں زنا کی جھوٹی تہمت) ۵۔ چوری، ۶۔ شراب۔ بعض علماء بغاوت اور فساد فی الارض کو ساتویں حد مانتے ہیں اور بعض علماء اسے تعزیرات میں شامل کرتے ہیں، اور یہی صحیح ہے۔

۸۔ اسلام کا نظامِ تعزیر اور تطبیق کی صلاحیت یہ کانفرنس کا آٹھواں موضوع تھا جو ساتویں اور نویں سے متعلق بھی ہے لیکن فقہ اسلامی کے الفاظ اور قانونی حد بندیوں کی وجہ سے ان کو الگ الگ موضوع بنایا گیا تھا اور فقہی و علمی تعریف اور عملی تطبیق کی رو سے وہ اس کے محتاج بھی تھے۔ شرعی زبان میں تعزیر اس سزا کا نام ہے جس کی حد شارع نے مقرر نہ کی ہو اور اُولی الامر کو اس بات کا حق ہو کہ وہ موقع اور حالات کے مطابق جو سزا مناسب ہو وہ تجویز کرے۔ تعزیر کے معنی تادیب کے بھی ہیں۔ وہ جرم جن میں کوئی حد یا قصاص شارع کی طرف سے مقرر نہیں ہے، جیسے رمضان میں افطار، نماز نہ پڑھنا، لڑکیوں کو چھیڑنا، اسمگلنگ کرنا اور ہر قسم کے اجتماعی، واخلاقی و معاملاتی مفاسد۔ ہمیشہ باقی رہنے والی شریعت کے لیے، اور نت نئے جرائم اور

مفاسد کو روکنے کے لیے اسلامی قانون میں تعزیرات کی بڑی ضرورت تھی، اور یہ انتہائی حکیمانہ قانون ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر منصور محمد الشیخ، اور ڈاکٹر عبدالعزیز عامر نے مقالے سنائے۔

۹۔ قصاص کن جرائم میں ہوگا؟ کانفرنس کا ساتواں اجلاس ۹ مئی کی شام کو شروع ہوا، اور ۶ بجے سے لیکر ۹ بجے تک بہت مفید تفصیلی بحث مباحثہ ہوا۔ اس کے بعد آج شام کا موضوع قصاص شروع ہوا قصاص کے سلسلہ میں تفصیلی طور پر عالمی ضمیر سے متعلق گفتگو ایک صفحہ قبل کر چکا ہوں۔ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس موضوع میں قصاص فی النفس یعنی قتل اور جان کا بدلہ داخل ہے۔ یہ بتایا گیا کہ اس سے بڑھ کر عدل اور کیا ہو سکتا ہے کہ قاتل کو قتل کیا جائے تاکہ معاشرہ زندہ رہے اور قتل کرنے والا اپنے انجام سے باخبر ہو کر قتل کا ارادہ ترک کر دے۔ جن ملکوں میں قتل کی سزا ختم ہو جاتی ہے تجربہ و مشاہدہ ہے کہ وہاں خودبخود شرح قتل بڑھ جاتی ہے۔ قتل عمد کی صورت میں قصاص ہی سب سے زیادہ عادلانہ سزا ہے لیکن معافی کا حق ولی کو ہے، اور دیت بھی ادا کی جائے گی، قتل غیر عمد کی صورت میں دیت ادا کرنی ہوگی جو مجرم کی عاقلہ یا دیوان ادا کرے گا جس کی تفصیل احناف و دوسرے ائمہ کے اقوال فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے موجود ہے۔ اس موضوع میں قصاص دون النفس پر بھی گفتگو ہوئی، یعنی جان بوجھ کر ہاتھ پیر یا آنکھ، ناک، کان کاٹ دینے یا تلف کر دینے کا بدلہ۔ اسلام قصاص کی شکل میں بدلہ ادا کرانے کا قائل ہے تاکہ جرم پسند طبیعتیں مجبور اور کمزور لوگوں کے اعضاء کاٹنے کی عادی نہ بن جائیں۔ معافی یا دیت قبول کرنے کا حق اسی کو ہے جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، اور یہ بالکل صحیح اور فطری بات ہے کیونکہ مجرم کے جیل چلے جانے یا جرمانہ خزانۂ شاہی میں داخل ہو جانے کی صورت میں مظلوم کی دادرسی کچھ بھی نہیں ہوتی پھر دیت کی فقہی تفصیلات اور عقلی فوائد بھی بیان کیے گئے اور یہ بھی واضح کیا گیا کہ جو اعضاء تعداد میں دو دو ہیں ان میں نصف دیت ہوگی، غلطی سے کسی عضو کے تلف ہو جانے کی صورت میں قصاص نہیں ہوگا بلکہ دیت ہوگی اور معاف کرنے کا حق مظلوم یا اس کے ولی کو ہوگا۔ دیت کی مقدار اور فقہی مباحث تفصیل طلب ہیں اور اس اختصار میں ان کو بیان کرنا مشکل ہے۔ وقت کی کمی وجہ سے آج اس موضوع پر صرف ازہر یونیورسٹی کے وائس چانسلر شیخ ڈاکٹر محمد حسن فائد کی تقریر ہو سکی۔

۱۰ مئی کی صبح کو آٹھویں اجلاس میں کل کے موضوع قصاص ہی پر استاذ مفتی بہنسی اور ڈاکٹر عمر مولود، عبدالحمید لکچرار لغۃ و شریعۃ کالج نے تفصیلی مقالات پڑھے۔

(باقی)

اشتراکی روس میں مسلمان

حاجی ایم ترکستانی

(۲)

مقامی کمیونسٹ پارٹی کی تنظیمات نے تمام کارخانوں، زراعتی فارموں، قہوہ خانوں اور اجتماعات کے دیگر مقامات پر خلافِ مذہب پراپیگنڈے کا پورا پورا اہتمام کیا ہے۔ خصوصاً ان علاقوں میں جہاں مسلمان آباد ہیں، سوویٹ حکمران اسلام کو مٹانے کے لیے ابلاغِ عامہ کا ہر ممکن ذریعہ بڑی چابکدستی سے استعمال کر رہے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر صرف ایک ہی مقصد ہے کہ کسی طرح اسلام کا مکمّل قلع قمع کیا جائے۔ اشتراکی کسی ایسے مذہب کے وجود کو گوارا نہیں کر سکتے جو انسان کی بالادستی سے ماورا ذاتِ خداوندی کی بالادستی کا علمبردار ہو۔ اشتراکیت ایک سیاسی مذہب کی حیثیت سے اپنے ماننے والوں کی پوری زندگی پر تسلّط قائم کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ ریاستیں جو اس کے نفاذ کے درپے ہیں ان کا مزاج سراسر کُلّیت پسندانہ ہے اور وہ انسانوں کے دل و دماغ کو بھی اس کے نظریات کے مطابق منضبط کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اشتراکیت کے جاں نثاروں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے استعماری اور توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کے لیے انسانوں کو بطور ہتھیار استعمال کر سکیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اشتراکی حکمران اس ذلیل پروپیگنڈے سے اپنے ناپاک مقاصد حاصل کر رہے ہیں؟ اب تک جو حالات و واقعات سامنے آئے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ یہ لوگ اپنے مقاصد میں کوئی زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔

اشتراکی روس کے مسلمان علاقوں میں سادہ لوح عوام ہی نہیں بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے ارکان بھی اسلام کے وفادار رہے ہیں۔ ازبک زبان کی ایک تازہ ترین تصنیف میں بھی اس حقیقت کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف لکھتا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ پارٹی کے ارکان ابھی تک مذہبی فرائض اور رسُومات بجا لاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہے":

ازبکستان کمیونسٹ کا اداریہ نویس لکھتا ہے کہ مذہبی لوگوں کی بھرپور سرگرمیوں کی وجہ سے شہریوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے مذہبی فرائض کی بجا آوری شروع کر دی ہے۔ مقدس مقامات پر زائرین کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ مذہبی تہواروں پر لاتعداد جانور ذبح کیے جاتے ہیں۔ اس سے ملکی معیشت کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔ علاوہ ازیں ہزاروں کارکن کام پر نہیں جاتے اور اس طرح مزدور قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہیں"۔

اشتراکی حکّام کی زبانی مسلمانوں کی مذہبی استقامت کی شکایات روسی اخبارات اور کتب میں اکثر نظر آتی رہتی ہیں۔ قرغزستان کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک سربراہ (K. I. KOJTSHUMANOV) نے اس ضمن میں ایک دلچسپ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے جس کا عنوان ہے "قرغزستان میں ملحدانہ پروپیگنڈا کی چند خصوصیات"۔ اس میں اُس نے لکھا ہے کہ انقلابِ اکتوبر کے بعد فرونز کے موجودہ شہر پشپک میں چھ مساجد تھیں۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک یہ بدستور قائم رہیں۔ خلافِ مذہب کارروائیوں کے ضمن میں انہیں تدریجاً بند کر دیا گیا لیکن ۱۹۴۴ء میں فرونز کی پرانی مساجد دوبارہ کھل گئیں اور کئی نئی مساجد بھی تعمیر ہوئیں۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ صوبہ اُش کے ازجن علاقہ میں تیلیمن کے مقام پر پُرانی مسجد کئی بار غیر قانونی طور پر کھول لی گئی، اور ہر مرتبہ نام نہاد مسلمانوں کی مرضی سے اُسے بند کر دیا گیا۔ آخر کار ملحدانہ پروپیگنڈا کی شدت کے باعث یہ مسجد ہمیشہ کے لیے بند کر دی گئی۔ حکّام مطمئن ہو گئے اور معاملہ ہمیشہ کے لیے دفن سمجھ لیا گیا مگر پھر یہ خانۂ خدا نمازیوں کے لیے کھولنی پڑی۔

اس مقالہ نویس نے اپنے مقالے میں ایک اور دلچسپ حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ "الباشی" علاقہ میں کوبیش کے مقام پر ساری مذہبی رسومات ملا ابراہیم سلوف کی اقتدا میں ادا کی جاتی ہیں درآنحالیکہ سرکاری طور پر اسے کوئی مذہبی تعلیم حاصل نہ تھی۔ نماز جنازہ پر اسے ۳۰ سے ۵۰ روبل تک مل جاتے تھے۔

مزید برآں یہی مصنف تسلیم کرتا ہے کہ مسلمان علاقوں میں کئی مقامات پر سرکاری طور پر کوئی امام مقرر نہیں (اور مسلمانوں کی دینی رہنمائی غیر سرکاری ائمہ کرتے ہیں)۔ فاضل مصنف نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ قرغزستان میں دو قسم کے ائمۂ دینِ حق کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ایک سرکاری ائمہ اور دوسرے غیر سرکاری

ائمہ جو مختلف علاقوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ مذہبی قائدین کی زیادہ تعداد ان غیر سرکاری ائمہ پر مشتمل ہے جو مساجد کے باہر تبلیغ دین کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ یہی آئمہ عوام میں مذہبی پروپیگنڈا اور مذہبی شعائر کے معاملے میں روسی قوانین کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس طرح لوگوں کو دینِ اشتراکیت کا باغی بناتے ہیں۔ مقالے کے آخر میں مصنف رقمطراز ہے کہ خدا کو ماننے والے ایسے راسخ العقیدہ لوگ بھی موجود ہیں جن کا ایمان غیر متزلزل ہے۔ روس میں ایک نہیں بلکہ متعدد ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اشتراکی خواہ کتنی ہی کوشش کریں عوام کے دل سے مذہب کو محو نہیں کیا جا سکتا اور ساری مذابیر کے باوجود اسلام کو روس سے ختم نہیں کیا جا سکا۔

وہاں کے مسلمان اسلامی طرزِ زندگی کو از سرِ نو اپنا رہے ہیں۔ اس حقیقت سے آگاہ ہو جانے کی وجہ سے ہی روسی حکومت نے ان اسلامی اداروں کو کسی نہ کسی صورت میں قائم رکھا ہے تاکہ روس مسلمانوں کی اسلامی سرگرمیوں اور ان کی معاشرتی زندگی پر اپنا تسلط قائم رکھ سکے۔ ان اسلامی اداروں کے قیام کا ایک اور مقصد دنیا کے مسلمانوں کو دھوکہ دینا بھی ہے تاکہ وہ ایشیائی اور افریقی مسلمانوں پر واضح کر سکے کہ اشتراکی روس میں اسلام "آزاد" ہے۔ روسی حکمران اپنی اس "اسلام نوازی" کے ثبوت میں ان چند اداروں، سکولوں، مساجد (جو واگذار کر دی گئی ہیں)، کو پیش کرتے ہیں۔ سوویٹ یونین کے مقرر کردہ مفتی مسلم ممالک کو یہ باور کرانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں کہ اشتراکی نظامِ حکومت اسلام کے خلاف نہیں۔ اس سلسلے میں مفتی ضیاء الدین بابا خانوف جسے بیرونی دنیا مفتی ضیاء الدین خاں ابن احسان بابا خاں کے نام سے یاد کرتی ہے اور جو وسطی ایشیا اور قازقستان کے مسلمانوں کے لیے تاشقند کے مذہبی ادارے کے صدر رہیں، روسی حکومت کے لیے بڑے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ وہ بخارا کے مخصوص چغہ میں ملبوس روسی حجاج پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے مکہ میں بھی اکثر نظر آتے ہیں، کبھی قاہرہ میں ایشیائی افریقی اتحاد کانفرنس میں روسی نمائندے کی حیثیت سے بھی شریک ہوئے ہیں اور کبھی روس کی سرپرستی میں سٹاک ہالم میں منعقد ہونے والی عالمی امن کونسل میں روس کی نمائندگی کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ اور کبھی دہلی اور جکارتہ میں روس کی خیرسگالی کے لیے تشریف لاتے ہیں وہ سوویٹ یونین کے باہر امن کے "مردِ مجاہد" اور انصاف کے علمبردار کا کردار ادا کرتے ہیں۔ بہر حال اشتراکیت کی اس طرح خدمت کرتے ہوئے وہ اسلام اور مسلمانوں کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے سکتے بلکہ انہیں فریب دینے کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

روس اپنی خارجہ پالیسی میں ان چند نام نہاد اسلامی اداروں کی موجودگی سے کس طرح ناجائز فائدہ اٹھارہا ہے اس کا ہلکا سا اندازہ اس کانفرنس سے لگایا جاسکتا ہے جو اکتوبر ۱۹۷۰ء میں تاشقند میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں روس کی طرف سے مختلف مذاہب کے ایک سو نمائندے شریک ہوئے۔ باہر سے پچیس مختلف ممالک کے چالیس مسلم نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس کانفرنس کی تیاریاں مہینوں پہلے سے کی جارہی تھیں۔ ۲۲ مئی ۱۹۷۰ء کو "تاس" نے اعلان کیا تھا کہ اس کانفرنس کا خاص مقصد عالمی امن کے قیام کے سلسلے میں مسلمانوں پر اسلام کی طرف سے جو ذمّہ داری عائد ہوتی ہے اس سے انہیں عہدہ برا کرنا ہے۔ نیز یہ کہ دنیا کے بعض علاقوں خصوصًا جنوب مشرقی ایشیا اور مشرقِ وسطٰی میں شہنشاہیت کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کے پیشِ نظر اسلامی دنیا کے اتحاد کو تقویت پہنچانا ہے۔ لیکن تاشقند میں جن امور پر بحث ہوئی ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ قرآنی تعلیمات اور عوامی قوانین کے مطابق شہنشاہی اور نسلی خطرات کو روکنے کے لیے مسلم اتحاد کا قیام اور اس کا استحکام۔

۲۔ مشرقی عرب ممالک اور جنوب مشرقی ایشیا میں شاہی اثر ونفوذ کے خلاف جدوجہد کے متعلقہ مسائل۔

۳۔ موجودہ دور میں اسلام کے معاشرتی اصلاحی پہلو۔

اس کانفرنس میں حصہ لینے والوں اور خصوصًا روسی نمائندوں نے جو تقاریر کیں اور بین الاقوامی مسائل پر جو بحث کی اس میں روس کی خارجہ پالیسی کو بڑی شدّومد کے ساتھ سراہا گیا لیکن کسی نے بھی روسی مسلمانوں کی مظلومیت کی طرف اشارہ نہ کیا۔

مفتی بابا خانوف نے اپنی افتتاحی تقریر میں تمام مسلمان ممالک اور مسلمان تنظیموں اور لیڈروں سے اپیل کی کہ وہ امنِ عالم کی خاطر استعماری سازشوں کے خلاف جدوجہد میں اتحاد اور یک جہتی کا ثبوت دیں۔ بابا خانوف نے نہ تو روسی ریشہ دوانیوں کا کوئی ذکر کیا اور نہ اس کانفرنس کے معزز شرکاء کو اُن واقعات سے آگاہ کیا جو تاشقند اور ازبکستان کے دیگر مقامات پر مئی ۱۹۶۹ء میں پیش آئے۔ روسی زبان میں شائع ہونے والے ہفت روزہ "پوسوف" نے اس امر کا انکشاف کیا کہ مئی کے وسط میں ازبکستان کے کئی مقامات پر ایسے اجتماعات اور عوامی مظاہرے شروع ہوئے جن میں "روسیو! ازبکستان سے نکل

جاؤ" کے نعرے بلند کیے گئے۔ ان مظاہروں نے ایسی خطرناک صورت اختیار کرلی کہ فوجی دستوں کو تاشقند بلانا پڑا۔ تاشقند اور دوسرے شہروں سے ایک سو پچاس افراد گرفتار کر لیے گئے۔ یہ گرفتار شدگان سب کے سب مسلمان تھے جو اپنے ملک کو خود مختار اور روسی نوآبادیاتی نظام کے چنگل سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ بابا خانوف اور کسی دوسرے ملازم امام کو مسلمانوں کے اس منصفانہ مطالبہ کی حمایت کی توفیق نصیب نہ ہوتی ظاہر ہے کہ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کے آقا ان کی گردنیں مار دیتے۔

اشتراکی سلطنت سے باہر کے مسلمانوں پر اثر انداز ہونے کے لیے روسی حکومت مسلمان رہنماؤں اور مذہبی شخصیتوں کو اپنے ہاں بلاتی رہتی ہے۔ اسی خاطر اس نے تاشقند، سمرقند اور بخارا کو نمائشی مقامات بنا رکھا ہے۔ اس طریقہ سے بعض اوقات اُسے اپنے مقاصد حاصل ہو بھی جاتے ہیں مثال کے طور پر ڈاکٹر عبدالغفار کا ذکر مناسب رہے گا جنہیں اپنے ڈھب پر لانے کے لیے روس کے دورے کی مسلسل دعوتیں دی جاتی رہیں۔ بالآخر انہوں نے یہ دعوت قبول کرلی۔ چنانچہ گذشتہ موسم گرما میں انہوں نے اشتراکی روس کا دورہ کیا۔ مصر کے معروف اخبار الاہرام کی اطلاع کے مطابق اس دورے سے پہلے روسی سفارت خانے کے افراد تین ہفتوں تک ہر روز الازہر میں آتے جاتے رہے تاکہ ڈاکٹر صاحب کے دورے کے لیے ضابطے کی دیگر کارروائیوں کو مکمل کیا جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جانے والے ایک سابق وزیر فہمی ہویدی نے دورے کے بعد لکھا کہ "اس امر کا فیصلہ اہلِ مصر کے ہاتھ میں تھا کہ اس دورے میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کتنے دیگر افراد شریک ہوں اور کتنے عرصہ کے لیے وہاں قیام کریں۔ ان حالات سے ظاہر ہو گیا ہے کہ روسیوں نے اسلام اور دیگر مذاہب کے متعلق اپنا نظریہ تبدیل کرلیا ہے"۔

دوسری مثال عرب دنیا کے ایک معروف مذہبی رہنما شیخ محمد الاشمر کی ہے جنوری ۱۹۵۶ء میں جب وہ روس کے دورے سے واپس آئے تو انہوں نے دمشق میں یہ بیان دیا کہ "روسی حکومت نے اپنے ہاں کے مسلمانوں کو جو آزادی دے رکھی ہے۔ اس کی پوری طرح تعریف و توصیف کی جانی چاہیے۔ میری دلی خواہش ہے کہ میرے ملک شام میں بھی مسلمانوں کو وہی مقام حاصل ہو جائے جو انہیں روس میں حاصل ہے۔

اشتراکی حکومت سے باہر کے مسلمانوں پر اثر انداز ہونے کی ایک اور مثال پاکستان کے ایک

مذہبی گروہ کے رہنما مولانا عبدالحامد قادری بدایونی کی ہے

روسی حکومت نے انہیں ۱۹۵۷ء میں دورۂ روس کی دعوت دی تھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ تاشقند اور سمرقند میں مسلمانوں کو اپنے مذہب اور دینی شعائر پر عمل پیرا ہونے کی پوری آزادی ہے۔ مساجد قبرستان اور دوسرے مذہبی مقامات بھی مکمل طور پر آزاد ہیں۔

اس طرح کی اور بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو مسلمان ممالک کے یہ قائدین اور مذہبی رہنما روسی مسلمانوں کے مسائل اور اسلام کے متعلق روسی عزائم سے آگاہ نہیں یا پھر انہوں نے یہ بیانات صرف اپنی خارجہ پالیسی کے مخصوص مصالح کے پیش نظر دیئے۔ معاملہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ایسے بیان دینے والے حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ ایسے بیانات سے خود ان کے اپنے ممالک میں مارکسزم اور لینن ازم کے لیے راستے صاف ہوتے ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ روس کا دورہ کرنے والے بعض مذہبی رہنماؤں اور لیڈروں نے وہاں کے مسلمانوں کے مسائل کا بغور مطالعہ کیا۔ اور اسلام کے متعلق روسیوں کے طرز عمل کو بغور دیکھا۔ اس ضمن میں مذکورہ بالا پاکستانی وفد کے ارکان مولانا عبدالوہاب اور مولانا راغب احسن کے بیانات بڑے دلچسپ ہیں۔ انہوں نے بڑی شدومد کے ساتھ مولانا بدایونی کے بیان کی تردید کی اور روسی حکومت کے اس دعویٰ کو کہ روس میں اسلام کو مکمل آزادی حاصل ہے، بالکل غلط قرار دیا۔ مولانا عبدالوہاب نے پاکستان آبزرور میں لکھا کہ روسی مسلمان مذہبی عبادات ادا کرنے کی آزادی سے محروم ہیں۔ وہ اپنے جوانوں کو مذہبی تعلیم بھی نہیں دے سکتے اور ان کی ثقافت و تہذیب کا بڑے منظم طریقے سے خاتمہ کیا جا رہا ہے۔

مولانا راغب احسن صاحب نے بین الاقوامی امور کے پاکستانی ادارے کے زیر اہتمام کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پورے روس میں ایک بھی ایسا ابتدائی سکول نہیں جہاں اسلام کے اصولوں کی تعلیم دی جاتی ہو۔ روسی مسلمانوں کو اس بات کی بھی اجازت نہیں کہ وہ مذہبی مسائل پر ابتدائی درسی کتب یا اسلام اور اس کی تہذیب و تاریخ سے متعلق، دوسری کتب شائع کرسکیں۔ روس میں ایک بھی مسجد یا مذہبی ادارہ ایسا نہیں ہے جو صحیح معنوں میں آزاد ہو۔ روسی مسلمانوں کو مساجد کی آمدنی پر بھی ایسا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اسے اپنے طور پر دینی تعلیمات کی ترویج و اشاعت پر خرچ کرسکیں۔ روس

میں اسلام کے مبادیات کی تعلیم دینے کے قابل اساتذہ تک موجود نہیں ہیں۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوویٹ یونین کے اشتراکی حکمرانوں نے اسلام کے متعلق ہمیشہ دو رُخی پالیسی اختیار کی ہے۔ جب روسی حکومت کمزور تھی تو اشتراکی حکمرانوں نے عوام کو مذہبی آزادی کا یقین دلایا اور جب ان کی حکومت مضبوط ہوگئی تو انہوں نے اپنے سارے وعدے نظر انداز کر دیئے اور اسلام پر تابڑ توڑ حملے شروع کیے۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اشتراکی روس میں موجودہ اسلامی اداروں کے ذریعے وہ مسلمانوں کی روحانی زندگی اور اسلامی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ اور ان پر حکومت کو مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ روسی حکام اپنے پروپیگنڈے اور خارجہ پالیسی میں انہی اداروں کے بل پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سوویٹ یونین سے معاملہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ بات ضرور ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیے۔ دنیائے اسلام کے مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کو روسی پروپیگنڈے کی اس خاص تکنیک کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے بعد ہی وہ کہیں اس قابل ہو سکتے ہیں کہ اسلام کے خلاف روسی معاندانہ سرگرمیوں کا مؤثر تدارک کر سکیں اور دنیائے اسلام میں اتحاد و استحکام پیدا کر سکیں۔

مطبوعات

ترکی ۔ قدیم و جدید۔ تالیف: مولانا خلیل احمد حامدی۔ شائع کردہ: اسلامک پبلیکیشنز شاہ عالم مارکیٹ، لاہور۔ قیمت آٹھ روپے۔ صفحات ۳۱۲۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے مصنف علمی حلقوں کی ایک معروف دینی شخصیت ہیں۔ عالمِ اسلام خصوصاً عرب ممالک کے بارے میں اُن کی آراء بڑی وقیع بلکہ استناد کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کتاب میں جو فاضل مصنف نے رُوداد سفر کی صورت میں مرتب کی ہے، ترکی قدیم و جدید کے معاشرتی، سیاسی اور دینی حالات پر نہایت قابلِ اعتماد معلومات فراہم کی ہیں۔ اس تصنیف کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ مصنف نے ایک مسلمان کی حیثیت سے اس خطۂ ارضی کا جائزہ لیا ہے جو صدیوں تک اسلامی خلافت کا مرکز رہا ہے اور جس میں اسلامی تہذیب و تمدن کے آج تک نہایت واضح اور درخشاں نقوش پائے جاتے ہیں۔

یُوں تو یہ پُوری رُوداد سفر بڑی ہی دلچسپ اور فکر انگیز ہے لیکن اس کے وہ حصے خاص طور پر اُمتِ مسلمہ کے لیے بڑے ایمان افروز ہیں جن میں ترکی کے اندر احیاءِ دین کی کوششوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس سے ذہن کو سکون اور قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ نوجوان نسل مغربی تہذیب کے طلسم سے آزاد ہو کر دینِ حق کو پُوری یکسوئی اور اعتماد کے ساتھ قبول کر رہی ہے۔

فاضل مصنف کا اندازِ تحریر بڑا دلکش ہے۔ مطالعہ کے دوران قاری اس میں کھو سا جاتا ہے اور یُوں محسوس کرتا ہے کہ وہ ترکی کا تاریخی ارتقاء اور اس کی زندگی کے مختلف مناظر خود اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔

تصاویر اور نقشوں نے کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ طباعت اور کتابت کا معیار عمدہ ہے۔

(بقیہ اشارات)

مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے منقطع کرنے کے لیے جن نفسیاتی محرکات اور تخریب پسندانہ رجحانات کی ضرورت تھی اُن کی اچھی طرح پرورش کر لینے کے بعد عملاً جو کچھ ہُوا وہ ان محرکات اور رجحانات کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ ذہن تو ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کے آتش گیر مادے سے پہلے ہی بھرے ہوئے تھے صرف چنگاری لگانے کی ضرورت تھی وہ بھارت نے بڑی عیاری کے ساتھ لگا دی۔ اور اس طرح مشرقی پاکستان میں بغاوت کی آگ بڑی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگی۔ پاکستانی فوج نے جب طاقت کے زور سے اسے فرو کرنے کی کوشش کی تو بھارت براہِ راست اور روس اس کے سرپرست کی حیثیت سے درمیان میں آدھمکے اور اس طرح پاکستان کے مشرقی بازو کو مغربی بازو سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔

مشرقی پاکستان میں ملک کے تحفظ کے لیے جو لڑائی بھی لڑی گئی اُسے دیکھتے ہوئے کوئی عقلمند شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ پاکستان کے سربراہ اس معاملے میں سنجیدہ تھے۔ یہ لڑائی تو درحقیقت ایک نمائشی جنگ کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ مشرقی پاکستان کی جغرافیائی حیثیت کا جائزہ لیتے ہوئے اس حقیقت کو ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی جان سکتا ہے کہ مغربی پاکستان سے براہِ راست مشرقی پاکستان کا تحفظ نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس امر کی ضرورت تھی کہ اس خطے میں ایسے مؤثر اور وسیع انتظامات کیے جاتے جن سے اس حصے کا بخوبی دفاع کیا جا سکتا۔ اس کے لیے اپنے دوست ممالک سے بھی پُوری پُوری امداد اور تعاون حاصل کرنے کی ضرورت تھی مگر ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی ان سے جان بُوجھ کر اغماض برتا گیا۔ کیونکہ اصل مقصد اس حصے کو بچانا نہ تھا بلکہ کھونا تھا۔ آٹھ ڈویژن فوج کو بلا سوچے سمجھے میدانِ جنگ میں اتار دیا گیا لیکن اس کے لیے نہ تو کمک پہنچانے کا کوئی انتظام کیا گیا اور نہ ہوائی حملوں سے تحفظ کی کوئی مؤثر تدابیر اختیار کی گئیں۔ دورِ جدید میں جس فوج کو ہوائی تحفظ حاصل نہ ہو اور جسے اس بات کا یقین نہ ہو کہ اُسے جنگ کی حالت میں برابر کمک پہنچتی رہے گی وہ کس طرح دیر تک اُس دشمن کے خلاف صف آرا ہو سکتی ہے جو نہ صرف تعداد بلکہ اسلحہ اور دوسری جنگی سہولتوں کے اعتبار سے اُس سے کئی گنا بڑی طاقت ہو۔ جس قسم کے حالات مشرقی پاکستان میں پیدا کیے گئے تھے اور جس بے تدبیری کے ساتھ فوج کو بالکل بے یار و مددگار جنگ کی آگ میں جھونکا گیا تھا اس میں سوائے ہتھیار ڈالنے کے اور

کس نتیجہ کی توقع کی جا سکتی تھی اور یہ سب کچھ کیا بھی اس لیے گیا تھا کہ پاکستان کے دونوں بازو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور ان دونوں میں آمریت کے تسلط کے بھرپور مواقع فراہم ہو سکیں۔ مگر اب لوگوں کے دل و دماغ میں یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اس المیہ میں ان آمرانہ عزائم رکھنے والوں کا کوئی عمل دخل نہیں بلکہ یہ سب کچھ وہ محض مقدر کے طور پر قبول کر رہے ہیں۔ انہیں بدقسمتی سے اس ملک کی سربراہی کا منصب اس وقت سنبھالنا پڑ رہا ہے جب یہ تباہی کے بالکل دہانے پر پہنچ چکا ہے۔ مظلومیت کی تصویر بننے سے ان حضرات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام کے دلوں میں اپنے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ وہ ان کی بداعمالیوں پر نگاہ رکھنے کے بجائے انہیں مظلوم اور بے بس سمجھتے ہوئے ان کے ناروا تسلط اور ظالمانہ کارروائیوں کو ایک طویل عرصے تک برداشت کرتے رہیں درآنحالیکہ تباہی کے جس دہانے کا ذکر کر کے یہ عوام کے جذبات میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں اُس تک ملک کو پہنچانے والے خود یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اور جس بربادی کو یہ مقدر کہہ کر اور جن دردانگیز نتائج کو حقائق کا نام دیکر لوگوں کو انہیں قبول کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس بربادی اور اُن نتائج کے یہ حضرات خود ذمہ دار ہوتے ہیں۔

سقوطِ ڈھاکہ اور شملہ کانفرنس میں حکمران طبقے کا موقف اسی غلط اندازِ فکر کی پوری پوری شہادت فراہم کرتا ہے مشرقی پاکستان کسی آفتِ سماوی کی وجہ سے تو ہم سے الگ نہیں ہوا بلکہ اس ضمن میں جو کچھ ہوا ہے وہ حکمران طبقوں کی مسلسل حماقتوں کا بالکل طبعی نتیجہ ہے۔ اسی طرح شملہ کانفرنس میں ہم نے جو ذلت آمیز شرائط قبول کی ہیں تو یہ تقدیر کا کوئی ایسا اٹل فیصلہ نہیں، جس کے سامنے ہم سرِ تسلیم خم کرنے پر بالکل مجبور رہیں۔ ہم نے سب سے پہلے وہ حالات پیدا کیے جو ہماری شکست پر منتج ہوئے اور اب شکست کو فتح میں بدلنے کے لیے جس تدبّر، حکمت و دانائی، عزم، اخلاص اور قوتِ عمل کی ضرورت ہے اُسے ہمارا حکمران طبقہ نہ تو اپنانے کی ہمت رکھتا ہے اور نہ ارادہ، اس لیے وہ عوام کے ذہنوں کو شکست پر قانع کرنے کے لیے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا ہے یہ نوشتۂ تقدیر ہی ہے جس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہو سکتا۔

فہرست ایجنٹ حضرات تفہیم القرآن

۱۔ فیروز سنز لمٹیڈ، دی مال لاہور

۲۔ سید مسعود علی رضوی مکان نمبر ۱۰۶۹ ۔ بلاک ۱۴۱
فیڈرل بی ایریا ۔ رضوان آباد، کراچی ۳۰

۳۔ شیخ شوکت علی اینڈ سنز پبلشرز بک سیلرز اینڈ
سٹیشنرز، محمد علی جناح روڈ، کراچی

۴۔ میسرز تاج کمپنی لمٹیڈ، بندر روڈ، کراچی

۵ ۔ نورسی پبلیکیشنز، لیاقت آباد، کراچی

۶۔ میسرز یونائیٹڈ بک سیلرز اینڈ سٹیشنرز اردو بازار کراچی

۷۔ شیخ سنز، اردو منزل، اردو بازار کراچی

۸ ۔ پنجاب نیوز ایجنسی، اردو بازار کراچی

۹ شیر خان تاجر کتب اڈہ رام روڈ پاکستان چوک کراچی

۱۰۔ مکتبہ تعمیر افکارِ اسلامی، حکیم ابن سینا روڈ ناظم آباد کراچی

۱۱ ۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی، بندر روڈ، کراچی

۱۲ اقبال بک ہاؤس، ٹرام جنکشن، صدر کراچی

۱۳۔ اسلامک پبلی کیشنز چوک رنگ محل، لاہور

۱۴۔ فیض احمد، سہیل بک ڈپو، سرگودھا

۱۵۔ مکتبہ افکارِ اسلامی کارخانہ بازار عارف والا

۱۶۔ خواجہ محمد یونس نیوز ایجنٹ کندھ کوٹ

۱۷۔ فیض محمد خاں کوارٹر نمبر ۴، ای سی اینڈ ٹی کالونی ہزارہ

۱۸۔ ادارہ امتیاز صدر بازار کمالیہ ضلع لائل پور فون نمبر ۲۵

۱۹۔ غلام رحمانی، ضیا بک ڈپو بازار شہیداں ہوتی مردان

۲۰۔ محمد یونس ورائٹی بک سٹال، بک سیلرز اینڈ سٹیشنرز،
بنک روڈ، راولپنڈی کینٹ

۲۱۔ خان زمان خاں اینڈ کمپنی، غلہ منڈی سرگودھا

۲۲۔ مکتبہ اسلامی ریلوے روڈ صادق آباد ۔ رحیم یار خان

۲۳ شیخ سعید احمد خاکسار مارکیٹ فاروق جنرل سٹور ڈیرہ غازیخان

۲۴۔ رہنما پبلیکیشنز۔ والس روڈ، سکھر

۲۵۔ مکتبہ تعمیر ملت، ڈہرکی ضلع سکھر

۲۶۔ میسرز عزیز اینڈ سنز، شاہی بازار لاڑکانہ

۲۷۔ مکتبہ اسلامی، کورٹ روڈ، حیدرآباد سندھ

۲۸۔ محمد صاحب علی، امیر جماعت اسلامی نواب شاہ

۲۹۔ مکتبہ اسلامی بمعرفت دفتر جماعت اسلامی جیکب آباد

۳۰۔ رحمان نیوز ایجنسی، شارع فاطمہ جناح، کوئٹہ

۳۱۔ عزیزیہ کتب خانہ چوک صرافہ بازار ڈیرہ اسمٰعیلخاں

۳۲۔ ملت بک ڈپو، ریلوے روڈ، رحیم یار خاں

۳۳۔ ضیا بک ڈیلرز دا الہلال بکڈپو چمن بازار ہارون آباد

۳۴۔ مکتبہ احیائے ملت، کپ بازار، ملتان

۳۵۔ میاں محمد شفیع صاحب آڑھون مرچنٹ جناح
چوک میاں چنوں، ضلع ملتان۔

۳۶۔ مکتبہ افکارِ اسلامی، بازار نلواڑاں راولپنڈی

۳۷۔ عبدالعزیز دکان نمبر ۵ ۔ ۲۱ ۔ ایریا مارکیٹ
پی۔ او۔ ایف، واہ کینٹ

۳۸۔ شوکت کریانہ سٹور، مانسہرہ، ہزارہ

۳۹۔ عبدالرحمٰن شاہ خطیب جامع مسجد غزنی خیلاں بنوں شہر

۴۰۔ عبدالقدوس قیم جماعت صوبہ سرحد
تیا دروازہ ۔ پشاور۔